غالب

ایک شاعر، ایک اداکار

غالب

ایک شاعر، ایک اداکار

انیس ناگی

سنگِ میل پبلی کیشنز ○ چوک اُردو بازار - لاہور

ضابطہ

— ۱۹۸۷ء

تعداد — ایک ہزار
پبلشر — نیاز احمد
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
پرنٹر — آر-آر پرنٹرز، لاہور
قیمت — ۳۰/- روپے

فہرست

مطلع

کسی زبان کے ادب میں شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کرنے والی شخصیات گنی چُنی ہوتی ہیں۔ افکار و خیالات اور جذبات و احساسات کے فلک سالہا سال گردش میں رہتے ہیں تب کہیں الفاظ کے پردے سے عظیم شخصیت باہر آتی ہے۔ غالب کی ادبی و شعری عظمت بھی اسی تناظر میں مسلمہ ہے۔ غالب اردو شاعری کے تین بڑے شاعروں میں سے ایک ہیں۔ میر اور اقبال بھی اپنے اپنے میدانِ عمل میں منتہی ہیں۔ جذبے اور فکر کی تخلیقی آمیزش سے خیال و شعور کی کائنات کی متعدد جہات کی نشاندہی کارِ طفلاں نہیں ہے۔ اس کے لیے طویل فنی ریاضت کے ساتھ ساتھ، باریک بین آنکھ، رسا دماغ اور ہر دم زندہ اعصاب کا اثاثہ درکار ہے۔ غالب کی شاعری کی تازگی اور تخلیقی توانائی اسی اثاثے کی عطا ہے۔

غالب نے نثر کے میدان میں بھی جو کمالات دکھائے ہیں ان سے ایک زمانہ آگاہ ہے۔ فقرے کی سادگی اور چستی، اس کے بطن میں مشمولہ مرکب کوائف، کثیر المقصدی اظہارِ بیانیہ، مکالماتی، فکری، ڈرامائی عناصر سے مملو طرزِ تحریر، ایسی نثر کہ تقلید کو جی چاہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی ستر برس کی عمر تک ستر ہزار آدمی نظر سے گزر گئے ہوں گے غالب کی آدم شناسی ان کے خطوط کے ہر لفظ سے دانہ سپند کی طرح اُچھل کر باہر آجاتی ہے کافکا نے اپنی محبوبہ مالینا کے نام اپنے خطوط کو "لکھے ہوئے بوسے" کہا ہے۔ غالب کے خطوط بھی اسی نوع کی کیفیات کے مظہر ہیں۔ یہ لکھا ہوا پیار دوستوں، رفیقوں اور قرابت داروں کے لیے

تھا، ۱۸۵۷ء کے بعد ان کی زندگی میں آجانے والے تنہائی کے خلا میں یہ خطوط ان کے جینے کا بھروسہ تھے ۔ غالب کے خطوط اس امر کا کھلا ثبوت ہیں کہ مکتوب نویس وجودی بحران کا شکار ہے ۔

انیس ناگی نے غالب ایک شاعر ایک اداکار کے نام سے غالب پر لکھے ہوئے اپنے مضامین کی جو کتاب مرتب کی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب پر بے شمار لوگوں کے بے شمار مضامین کے باوجود ان کے فن و شخصیت کے متعدد پہلو دائرہ تحریر میں نہیں سمٹ سکے ۔ انیس ناگی نئی شاعری اور نئی تنقید کے وہ اہم نمائندے ہیں جن کے شعور کی بنت میں ——— فکر و فلسفہ اور شعر و ادب کے جدید ترین معیارات کے تانے بانے استعمال ہوئے ہیں ۔ وجودیت ، مارکسزم ، منطقی مثبت پسندی ، تازہ ترین نفسیاتی دریافتیں ان کے مطالعے کا حصہ ہیں ۔ فرانسیسی علامت پسند شعرا سے لے کر بیٹ نسل تک اور وکٹورین عہد کے شاعروں سے لے کر نوآبادیاتی عہد کے افریقی ، فلسطینی ، لاطینی امریکی شعرا تک بہت کچھ ان کے مطالعے کا حصہ بنا ہے ۔ یہی نہیں دنیا اور اردو کے کلاسیکی شعر و ادب پر بھی ان کی گہری نظر ہے ۔ ایسے میں ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ وہ جس بھی موضوع پر قلم اٹھائیں گے اس کے نئے اور نظروں سے اوجھل پہلوؤں کو بھی سامنے لے کر آئیں گے ۔

کلاسیکی اردو ادب کے حوالے سے انیس ناگی کی ایک کتاب "نذیر احمد کی ناول نگاری" قارئین سے بڑے پیمانے پر داد حاصل کر چکی ہے ۔ اس کتاب میں انھوں نے نذیر احمد کی سائیکی ، ماحول کے تناظر ، تاریخی اور اخلاقی احوال وغیرہ کی روشنی میں ان کے فکشن کا بھرپور مطالعہ کیا ہے ۔ غالب پر انیس ناگی کی یہ کتاب ان کی کلاسیک دوستی کا ایک اور ثبوت ہے ۔ نئے تنقیدی اور شعری دبستان سے وابستگی کے باوجود کلاسیکی شعر و ادب کی جانب ان کے جھکاؤ سے اس امر کا سراغ بھی ملتا ہے کہ انیس ناگی کا شعور یک جہتی نہیں ہے ۔ وہ ادب کی جدید ، نیم جدید اور کلاسیکی جہتوں کی پرکھ کو اپنے نئے ادبی مقاصد

کی تحصیل میں فراموش نہیں کرتے۔ نئی تنقید اور نئی شاعری کے معیارات کو مسلمہ ٹھہرانے والے ادیب کے لیے بہت مشکل ہے کہ وہ کلاسیکی شعر و ادب کو بھی اپنے مطالعے کا حصہ بنائے انیس ناگی نے اس مشکل پر بہ طریق احسن قابو پایا ہے اور نذیر احمد کے بعد اب غالب کے فن و شخصیت پر ایک پُر مغز کتاب تصنیف کی ہے۔ یہ کتاب جہاں انیس ناگی کی نفسیاتی اپروچ ان کی تاثریت، تحلیلی زاویہ نظر، جدید حسیت، علمیاتی و تیرے اور استدلالی فکر کو سامنے لاتی ہے وہاں اس سے غالب کے شعر و ادب کو بھی ایک نیا تناظر مہیا ہوتا نظر آتا ہے۔

انیس ناگی کے خیال میں غالب ایک لیجنڈ بن چکے ہیں اور ان کے بارے میں جس سطح کی تنقید کا اہتمام ہونا چاہیئے تھا اس سے اردو ادبی تاریخ کے صفحات خالی ہیں۔ غالب نے کسمپرسانہ زندگی تو گزاری ہی تھی موت کے بعد بھی ان کی تخلیقات اور ان کی ذاتی اشیا کو بطریق احسن محفوظ نہیں کیا گیا۔ انیس ناگی نے ۱۸۶۹ء کے بعد سے غالب پر لکھی ہوئی اہم تحریروں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان میں سے کوئی تحریر بھی اس نابغۂ روزگار شخصیت کا مکمل اور منصفانہ احاطہ نہیں کرتی، اس ضمن میں انیس ناگی نے میر مہدی مجروح، آزاد، حالی، ابوالکلام آزاد، عبدالرحمٰن بجنوری، ایس ایم اکرام، امتیاز علی عرشی، غلام رسول مہر، مالک رام، حمید احمد خاں کے غالب پر اہم کاموں کا جائزہ بھی لیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ غالب پر بے شمار لکھنے والوں نے قلم اُٹھایا تاہم ان کی تحریروں میں یکسانیت ہے۔

غالب پر ہونے والے مذکورہ اہم محققوں اور نقادوں کے کام کو بھی انیس ناگی نے رد کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان میں کہاں محض معاصرانہ اشاروں پر اکتفا ہے، کہاں وجہی انداز اختیار کیا گیا ہے، کس نقاد نے سطحیت کا دامن پکڑا ہے اور کس نے جذباتی انداز اختیار کیا ہے، غالب پر ہونے والی تنقید کے غیر معروضی، شیفتہ انداز کو بھی انیس ناگی نے ہدف تنقید بنایا ہے اور یہ بھی نتیجہ نکالا ہے کہ غالب کے بارے میں لاتعداد مغالطے پھیلائے گئے ہیں اور زیادہ تر میکانکی طرزِ تنقید کے سر دکا رکھا گیا ہے۔ مذکورہ نقادوں

نے اپنی تحریروں میں غالب کے کلام اور شخصیت کی ثنویت برقرار رکھی ہے۔انیس ناگی نے اپنی اس کتاب میں غالب کو اپنے معاصر عہد کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا ہے اور انھیں اپنے عہد میں ہونے والے واقعات سے لاتعلق بھی نہیں ٹھہرایا۔ انیس ناگی نے غالب کی ذات اور شاعری کو ایک کل میں ڈھال کر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

انیس ناگی نے غالب ایک شاعر ایک اداکار' غالب اور ابہام' اور غالب کی غزل کے عنوانوں کے تحت لکھے گئے اپنے مضامین میں غالب کی شاعری کو ان کی شخصیت اور ان کے معاصر عہد سے مربوط کر کے دیکھا ہے۔ غالب جو کچھ نہیں تھے وہ کچھ بننا چاہتے تھے اس کے لیے انھیں اداکاری کرنا پڑی وہ نواب نہیں تھے نوابی زندگی گزار رہے تھے انیس ناگی نے غالب کی کہانی کو دِلّی کے اجڑنے کی کہانی سے تعبیر کیا ہے ان کے ضعف کو ایک عہد کی ناتوانی کہا ہے۔ انھیں ان کی سوانح حیات میں ان کی معاصر زندگی کی جذباتی اور نفسیاتی حالتیں مضمر نظر آئیں۔ انیس ناگی غالب کی خاندانی، ازدواجی، معاشرتی اور انفرادی زندگی کے وقوعات کے تناظر میں ان کی پریشان گھریلو زندگی اور لاولدیت کے معاملات مالی تنگی ترشی اور زندگی گزارنے کے بلند منصوبوں کو زیرِ بحث لاتے ہیں ۱۸۵۷ء کے سیاسی اور تہذیبی حالات نے غالب کی شخصیت پر جو اثرات چھوڑے ان کا بھی انھوں نے بھرپور تجزیہ کیا ہے۔ انیس ناگی کو غالب کے عہد ہی کی طرح ان کی زندگی میں بھی اجتماعی نصب العین کی کمی نظر آئی۔ غالب کا زمانہ انفرادی اور اجتماعی دہشت کا زمانہ تھا۔ اس میں مصالحت اور مفاہمت کا دَور دَورہ تھا۔ یہ رویّے غالب کی شخصیت کا حصّہ بھی بنے۔ انیس ناگی نے یہ بھی لکھا ہے کہ غالب کو اپنی ناقدری کا مبالغہ آمیز احساس تھا۔ وہ پیشہ ور شاعر تھے۔ انھیں زندگی میں شاعری سے عزت حاصل ہوئی۔ غالب کی نجی اور اجتماعی زندگی کے تجزیے سے انیس ناگی نے غالب کی جو نفسیاتی تصویر کھینچی ہے اس کے مطابق غالب مبالغہ آمیز زندگی بسر کرتے تھے۔ انھیں اپنا سامنا کرنے کا حوصلہ نہ تھا، وہ پاش پاش انسان تھے، قناعت، صبر، استقلال، قوتِ ارادی، جنسی و عاملانہ صلاحیت،

قوتِ فیصلہ وغیرہ سے ان کا دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ وہ دہلی کے کھوکھلے نواب بھی نہ تھے نواب ہونے کی اداکاری کرتے تھے۔ غالب نے کئی جگہوں پر انفرادیت کا اظہار کرنے کی سعی بھی کی ہے۔ وہ خوف اور الزام سے بچنا چاہتے تھے۔ مغلوبیت، انفعالیت، سنکیت، تلخی، خود ترحمی، خود شکستگی، ملولیت، شکست خوردگی، گھبراہٹ، دُنیاداری اور تفوق پسندی وغیرہ کے نفسیاتی رویے ان کی شخصیت اور شاعری کا حصہ تھے۔ غالب بقول انیس ناگی زندگی اور شاعری میں شکوہ چاہتے تھے اور جو کچھ وہ نہیں تھے وہ بننے کے تمنائی تھے ''یہ ایک رول تھا جو انھوں نے اپنے لیے منتخب کیا اس لیے وہ اداکار تھے'' اس حوالے سے انیس ناگی نے غالب کی نوابیت کے ''پرسونا'' کے ریزہ ریزہ ہونے کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

''غالب کی ازدواجی زندگی'' ''غالب کا کلکتہ کا سفر'' ''غالب کی علالت'' ''غالب اور انگریز اور'' غالب اور پنجاب آرکائیوز'' کے عنوانات کے تحت لکھے گئے مضامین میں انیس ناگی نے غالب کی سوانح کے چند اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہی نہیں ان کے حوالے سے غالب کے شعروادب کے بعض پہلو بھی سامنے آئے ہیں۔ ان میں انیس ناگی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غالب کی شخصیت اور شاعری آپس میں غیر مربُوط بھی تھے۔ غالب کی بیوی امراؤ بیگم کا خاندان لوہارو سے تعلق رکھتا تھا۔ انیس ناگی نے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ لوہارو خاندان سے غالب کا تعلق خنکی اور لاتعلقی کا تھا۔ امراؤ بیگم سے بھی ان کے تعلقات میں طبعی اور خاندانی اختلاف تھا ان کی شادی ''مس میچ'' تھی اور خانگی زندگی بے سکون۔ غالب کا جوا اور شراب بھی امراؤ بیگم کو ناپسند تھے، ادھر غالب بقول انیس ناگی اخلاقی بزدلی اور منافقت کے معاشرے میں آزاد جنسی عمل کی باتیں کرتے تھے۔ غالب کو افلاطونی محبت پسند نہیں تھی۔ وہ عورت کے حسیاتی پہلو کو اہمیت دیتے تھے۔ کلکتہ کے سفر میں بھی انیس ناگی کے خیال میں غالب انگریز عورتوں کے نظارے میں محو ہو گئے یہ سفر ان کے نزدیک ڈان کہوٹے کا سفر تھا جس سے انھوں نے کچھ بھی حاصل نہیں کیا۔ البتہ مرزا قتیل سے معرکہ اس سفر کی اہم یادگار ہے، جہاں تک

انگریزوں سے غالب کے تعلقات کا مسئلہ ہے تو یہ تعلقات ناگی کے نزدیک خوشامدانہ تھے انیس ناگی نے غالب کے مخبر ہونے کے امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ انگریزوں کے تعلقات کے حوالے سے غالب کا فری میسن تنظیم کا رکن بننا بھی ایک اہم واقعہ ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود انیس ناگی نے یہ بھی لکھا ہے کہ انگریزوں سے غالب کا ربط دارتباط ایک کیموفلاج تھا وہ جہاں اپنی تحریروں میں انگریزوں کی فتح کا تذکرہ کرتے ہیں (تاکہ انگریزان سے ناراض نہ ہوں اوران کے مالی مفادات کا تحفظ ہو سکے) وہاں دِل کے اجڑنے پران کا دِل خون کے آنسو بھی روتا ہے۔ ان کا شاعرانہ ضمیر بھرپور انداز سے چیختا ہے۔ غالب کی علالت والے مضمون میں انیس ناگی نے غالب کی جسمانی بیماریوں کی وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی نفسیاتی بیماری میگیلیو مینیا کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ یعنی غالب برتری، حشم اور انفرادیت کے سراب میں مبتلا تھے وہ حکمرانوں پر اپنی اعلیٰ النسبی ثابت کرنا چاہتے تھے اور اپنے معاصرین پر اپنی شعری عظمت۔

غالب کی شاعری اور نثر کے حوالے سے انیس ناگی نے جہاں بہت سی معلومات غالب پر اپنے دیگر مضامین میں مہیا کی ہیں وہاں "غالب اور ابہام"، "غالب کی غزل" اور "غالب کی نثر" ان کے تین ایسے مضامین ہیں جن میں اس عظیم شاعر اور نثر نگار کی شاعری کا تجزیاتی احاطہ کیا گیا ہے۔ غالب کی شاعری میں ابہام کے ضمن میں انیس ناگی نے درست لکھا ہے کہ غالب ناسخ کی پیروی میں ایسی زبان ایجاد کرنا چاہتے تھے جس میں ہر طرح کے مضامین کو نشوونما مل سکے۔ غالب نے بیدل کے رنگ میں بھی ریختہ کہا۔ غالب کے ابہام کو لفظی موشگافیوں کا نتیجہ نہیں جاننا چاہیے یہ ایک تو ان کی زبان سازی کے عمل کا حصہ ہے، دوسرا اس لیے بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ متخیلہ کا غیر معمولی استعمال کرتے تھے، تیسرے غالب کے ہاں ابہام کی ایک وجہ ان کی تمثال سازی ہے وہ ایک مصرع میں تجریدی تاثر پیش کرتے ہیں اور دوسرے میں تجسیمی اس بنا پر بھی ان کے ہاں ابہام جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ تاہم غالب کی شاعری میں ابہام کی بڑی وجہ ان کی شاعری میں غیر مانوس نفسیاتی حالتوں کا منعکس ہوتا

ہے۔ انیس ناگی نے غالب کو اس اعتبار سے بھی بڑی اہمیت دی ہے کہ انھوں نے اُردو شاعری میں سب سے پہلے ابہام کا بحران پیدا کیا۔ غالب کے ابہام کے تناظر میں جب ہم ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں شاعرانہ لسانی مشقیں بھی نظر آتی ہیں اور قابلِ قدر تجربوں، انسانی بصیرتوں اور فلسفیانہ گہرائیوں کا اظہار بھی۔ یوں بھی ابہام کی اصطلاح اضافیت کے حوالے سے ہے ہو سکتا ہے کہ ایک دَور کی مبہم شاعری دوسرے دَور کے لیے عام فہم ہو جائے۔ انیس ناگی نے یہ مؤقف بھی پیش کیا ہے کہ غالب کا اپنا شعری انتخاب یا اس کے دوستوں کا انتخاب ان کی شاعری کے سارے لہجوں اور آہنگوں کو سامنے نہیں لاتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آج غالب کا از سرِ نو انتخاب کیا جائے۔ تاکہ قارئین کے سامنے ان کے جملہ شعری لہجے اور تدریجی تغیرات کا منظر نامہ آ سکے۔ انیس ناگی نے ابہام کے حوالے سے غالب کی شاعری میں تشکیل معانی کے معاملے کو بھی اہمیت دی ہے۔

جہاں تک غالب کی غزل پر لکھے گئے انیس ناگی کے مضمون کا تعلق ہے۔ انھوں نے غالب کو اُردو اور فارسی غزل کے روایتی موضوعات سے متعلق بھی کہا ہے اور لکھا ہے کہ ان کے ہاں مستعار تجربے بھی ہیں۔ غالب مابعد الطبیعاتی استفسارات، جذبہ اور تصور کی آمیخت اور جذباتی وحسیاتی رنگ کی بدولت غزل کی معنوی وسعتوں اور فکری گہرائیوں تک رسائی حاصل کر پائے۔ انیس ناگی نے غالب کی غزلوں کی کثیر المعنویت کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے ہاں تنہائی، قسمت کی جبریت، حزن اور فنا کے موضوعات کے مؤثر اظہار کی بات بھی کی ہے اور بتایا ہے کہ "غالب الفاظ کے نئے تعین دریافت کرتے ہیں۔"

غالب کے خطوط انیس ناگی کے نزدیک ایک عہد کی جذباتی وسیاسی صورتِ حال

کا احاطہ کرتے ہیں اور ان میں ایک تہذیب کی المناکی کی داستان بھی پوشیدہ ہے۔ انیس ناگی نے اپنی اس کتاب میں غالب کی سوانح کے نئے گوشوں کی نشاندہی کی ہے اور ان کا ان کے شعر و ادب سے تعلق بھی جوڑا ہے۔ یہ کتاب غالب کی شخصیت اور فن کے بارے میں نزاعی مباحث کا ایک ہنگامہ پرور سلسلہ بھی رکھتی ہے۔

سعادت سعید
۲۳۔ لاج روڈ لاہور

نومبر ۱۹۸۶ء

غالبؔ کا مُطالعہ

غالبؔ کی وفات کے بعد بھی ان کے دوستوں اور عزیزوں نے ان سے مشفقانہ سلوک نہیں کیا۔ ان کے شاگرد بھی کچھ گھامڑ قسم کے تھے، اُنھوں نے اپنے استاد کی کتابوں کی اشاعت اور ان کی حیات کی تفصیل کو یکجا کرنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔ ان میں سے شاید کسی کو یقین نہیں تھا کہ غالب ایک نابغہ فنکار تھے اور اُردو شاعری اور نثر کی روایت میں ایک لیجنڈ بن جائیں گے۔ اہلِ خانہ اور عزیز و اقارب کے لیے غالب کی ادبی سرگرمیاں کچھ مہمل سی تھیں کہ انھوں نے غالب کو عملی طور پر نکھٹو بنا دیا تھا، اُدھر ان کے متعلقین مالی سہولت کے لیے ان سے آس لگائے ہُوئے تھے۔ وہ اپنی اور دوسروں کی توقعات پُورا کرنے کے لیے اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ استعمال کر رہے تھے۔ غالب کی معیشت کا انحصار ان کی موروثی پنشن پر تھا، اگر لال قلعہ یا ریاست رام پور سے کچھ مل جاتا اس کو غنیمت جانتے۔ ناداری غالب کی واحد وراثت تھی۔ نہ کوٹھا نہ مکان، نہ پیسہ نہ دھیلہ، آٹھ سو روپے کے مقروض تھے کہ موت نے آ لیا۔ ظاہر ہے اس صورتِ حال میں ان کی بیوی امراؤ بیگم کا ردِّعمل لیا ہوگا۔ لیکن یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ غالب کس مپرسی کے عالم میں ایک مدت تک موت کے لیے سسکتے رہے مگر کسی نے بھی ان کی خبر نہ لی، انگریز حکام نے بھی اپنے "خان صاحب بسیار دوستان" کی عافیت تک نہ پوچھی یہی حال اپنوں کا تھا۔ لوہارو خاندان نے بھی اس بیمار، بوڑھے اور بے آسرا شاعر کی طرف

رُخ نہیں کیا — غالب کی وفات کے بعد ایک برس تک امراؤ بیگم زندہ رہیں، ان کا حال غالب سے بھی بُرا ہُوا۔ ان کی وفات کے بعد غالب کی آخری تحریریں، ان کی سندیں، خلعتیں کدھر گئیں؟ ایک روایت کے مطابق اہلِ محلّہ نے غالب کا گھر لُوٹ لیا تھا۔ اس طرح اس نابغہ کی ذاتی اشیاء بھی ہَوا ہوگئیں۔

مہدی مجروح غالب کے چہیتے شاگرد تھے اور انھوں نے چسکے لے لے کر بہت سے مکاتیب اس کے نام تحریر کیے تھے۔ مہدی مجروح (۱۸۳۷ – ۱۹۰۳ء) کو غالب کی صحبت کا بھی کافی موقعہ ملا تھا۔ غالب کی وفات کے بعد اس نے دہلی اخبار میں ان پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں اس نابغہ روزگار کے بارے میں کچھ بتانے کی بجائے مہدی مجروح نے نہایت واہیات قسم کی انشاپردازی کر کے آنے والی نسلوں کو غالب کے بارے میں براہِ راست معلومات سے محروم رکھا ہے — ۱۸۶۹ سے ۱۹۰۰ تک حالی اور آزاد کے سوا کسی نے غالب کی تحسین کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا، آبِ حیات میں غالب پر ایک مفصل باب ہے جس میں غالب کی سوانح کا مواد مکاتیب سے اخذ کیا گیا ہے، کچھ باتیں ذوق کے حوالے سے بھی بیان کی گئی ہیں جو اس لیے دلچسپ ہیں کہ یہ غالب کے بارے میں ہمعصری رائے کو پیش کرتی ہیں — آزاد کی غالب پر تنقید واجبی سی ہے، کہیں صفات کا استعمال زیادہ ہے اور کہیں کم — غالب پر پہلی مبسوط کتاب حالی کی یادگارِ غالب ہے جو ۱۸۹۶ء میں شائع ہُوئی۔ حالی ایک مجتہد نظریہ ساز نقاد شاعر تھے، انھوں نے حیاتِ غالب اور کلامِ غالب کا جو فریم ورک قائم کیا ہے اردو کا کوئی سوانح نگار اور نقاد اس سے باہر قدم نہیں رکھ سکا۔ حالی نے غالب کی جو تصویر مرتب کی ہے وہ سطحی ہے کیونکہ حالی کو غالب کا تقرب حاصل نہیں تھا، یہ بات بھی کچھ مشکوک ہے کہ حالی غالب کے شاگرد تھے۔ مکاتیبِ غالب یا ہمعصری تحریروں سے یہ سُراغ نہیں ملتا کہ حالی واقعی غالب کے شاگرد تھے۔ غالب کی موت پر حالی کا ردِ عمل ایک مرثیہ کی تحریر تک محدود رہا تھا۔ غالب نے ۱۸۶۹ء میں وفات پائی تھی

اور حالی نے ۲۸ سال بعد یادگار غالب تحریر کی تھی۔ غالب کی وفات کے ایک ماہ بعد اودھ اخبار کی ۱۶ مارچ کی اشاعت میں غالب کے ایک شاگرد محمد مردان علی رعنا نے اپیل کی کہ غالب کے کلام اور ان کی سوانح کو محفوظ کرنے کے لیے ایک سوسائٹی قائم کی جائے اور اس کام کی تکمیل کے لیے عطیات حاصل کیے جائیں۔ حالی سمیت کسی ایک نے بھی اس کام کی طرف توجہ نہیں دی۔ پھر ۱۹۱۱ء میں محمد علی جوہر نے اپنے اخبار کامریڈ میں غالب میموریل کی تعمیر کے لیے عطیات کی اپیل کی جس کے جواب میں حالی نے دس روپے چندہ دیا۔ ان واقعات سے کم سے کم یہ ظاہر ضرور ہوتا ہے کہ حالی کے یہاں غالب کے لیے کوئی اتنا شدید جذبہ نہیں تھا۔ حالی یادگارِ غالب کی تحریر کا محرک اپنے دوستوں کا اصرار بتاتے ہیں —— یادگارِ غالب حالی کی جوانی کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب ہے جو بڑھاپے میں لکھی گئیں۔ —— حالی ایک مدت سے دہلی میں مقیم تھے، وہ اغلباً ۱۸۶۰ء کے قریب غالب سے ملے تھے جب غالب کم و بیش معذور ہو چکے تھے۔ یادگارِ غالب کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ حالی کی غالب کے بارے میں جملہ معلومات مکاتیبِ غالب سے ماخوذ ہیں، اور جو سُنی سُنائی باتیں ہیں انھیں اس طرح بیان کیا ہے جیسے حالی اکثر غالب کی حاضری میں رہتے۔ یادگارِ غالب دو حصّوں میں تقسیم ہے، حِصّہ اوّل میں غالب کی سوانح بیان کی گئی ہے، حِصّہ دوم میں ان کی شاعری پر عمومی تبصرہ کیا گیا ہے اور ان کے بہت سے اشعار کی تشریح بھی کی گئی ہے —— اس کتاب کی سکیم انیسویں صدی انگلستان میں لکھی جانے والی بائیوگرافیز سے مماثل ہے جن میں مصنّف کی شخصیت اور اس کی تخلیقات کو جُداگانہ طور پر پرکھنے کا رواج تھا۔ یادگار اُردو کی اوّلین سوانح عمریوں میں سے ہے اس لیے اس میں ناپختگی ہے، اس کے مطالعے سے غالب کے بارے میں کوئی نقطۂ نظر مرتب نہیں ہوتا۔ غالب کی شخصیت کا کوئی نقش قائم نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ وہ ایک ہنسوڑ قسم کے شخص تھے اور جنھیں اپنی ناقدری کا احساس تھا۔

بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں غالب پر کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا ہے۔ ابوالکلام آزاد کے ایک دو مضامین اس دور میں شائع ہوئے جو غالب کی شخصیت کی تفہیم میں کافی معاون ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد غالب پر عبدالرحمٰن بجنوری کی محاسن کلام غالب شائع ہوئی، اس کتاب نے خوب شہرت کمائی۔ اس کے اوٹ پٹانگ غیر تنقیدی جملوں پر آہ واہ ہوئی۔ ایک مدت تک یہ کتاب تفہیم غالب میں کافی اہم رول ادا کرتی رہی۔ اس میں غالب کا موازنہ مغربی شعرا سے کیا گیا ہے۔ تنقیدی اعتبار سے محاسن کلام غالب گمراہ کن ہے کیونکہ بجنوری نے بلا سوچے سمجھے جذباتی انداز میں غالب کا موازنہ دانتے، گوئٹے اور نہ کن کن شعرا سے کیا ہے۔ کتاب کے ابتدا میں ان نقادوں کی مذمت کی گئی ہے جو غالب کا تقابل غیر ملکی شعرا سے کرتے ہیں، لیکن ابتدائی چند صفحات کے بعد بجنوری خود وہی اسلوب اختیار کرتا ہے جس کی وہ تردید کرتا ہے۔ محاسن کلام غالب کی شہرت اس کی جذباتی اور رومانوی نثر اور تیز جملوں پر تھی۔ اس کتاب کی اشاعت سے غالب کی تفہیم میں پیش رفت نہیں ہوئی۔ بجنوری نے بھی حالی کے تتبع میں کتاب کا بیشتر حصہ غالب کے اشعار کی تشریح کے لیے وقف کیا ہے۔

غالب کی سوانح اور کلام پر زیادہ مربوط اور مفصل کام ۱۹۳۰ء کے بعد شروع ہوا تھا۔ اس میں ایس، ایم، اکرام اور امتیاز علی عرشی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ایس، ایم، اکرام نے غالب کی زندگی اور ان کی شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کرکے ہر دور کے خصائص کو جداگانہ طور پر قائم کیا ہے، کہیں کہیں انھوں نے نفسیات بھی کام لیا ہے۔ کلامِ غالب کے بعض پہلوؤں کو داخلی اور خارجی شواہد کے ذریعے مختلف تخلیقی مرحلوں کا تعین کیا ہے۔ ایس، ایم، اکرام کلاسیکی مزاج کے نقاد تھے اور فارسی شاعری سے شغف رکھتے تھے، انھوں نے بھی غالب کے کلام اور شخصیت میں ان کی کلاسیکیت کو سراہا ہے، غالب کی فارسیت کی داد دی ہے لیکن غالب کو ان کے عہد سے مربوط نہیں کیا اور نہ ہی

ان کی ذات اور شاعری کو ایک کلیت میں منتقل کیا ہے۔ ایس ایم اکرام کی غالب پر دونوں کتابیں دلچسپ ہیں لیکن نقطہ نظر سے عاری ہیں۔ امتیاز عرشی کا کام زیادہ تر تحقیقی ہے۔ مکاتب غالب کی ترتیب اور ان پر مبسوط دیباچہ، نسخہ عرشی پر ان کا دیباچہ اور غالب پر ان کے متفرق مضامین معلوماتی ہیں ـــــ غلام رسول مہر اور مالک رام نے بھی غالب شناسی کا ثبوت دیا ہے لیکن ان کی غالب کی سوانح بھی میکانکی ہیں۔ تمام کتابوں کے ماخذ مکاتیب غالب ہیں یا وہ چند درخواستیں ہیں جو غالب نے حکام کو لکھی تھیں۔ غالب کے تمام سوانح نگاروں نے غالب کی تحریروں کی صداقت کو من وعن قبول کیا ہے اسی لیے وہ افہامِ غالب میں لاتعداد مغالطوں کا شکار ہوئے ہیں۔ غالب بڑی پیچیدہ نفسیات کے حامل تھے اور ان کا "دفاعی نظام" بھی کافی دلچسپ تھا، وہ بات سے بتنگڑ بنانے میں ماہر تھے، مثال کے طور پر غالب نے ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء کو ایک درخواست انگریز حکام کو اپنی پنشن بڑھانے کے لیے لکھی تھی اس میں انھوں نے تحریر کیا ہے کہ وہ اپنے والد کی جائیداد بیچ بیچ کر اپنی گزر اوقات کرتے رہے ہیں۔ یہ دعویٰ صداقت کا حامل نہیں ہے۔ اسی طرح غالب نے اپنے تتبعوں کے بارے میں کچھ بتانے سے گریز کیا ہے کہ ان میں سے ایک فاترالعقل تھا اور غالب کے لیے پریشانی کا سبب تھا۔ غالب نے اپنے مکاتیب میں اپنی شخصیت کے صرف چند پہلوؤں کا ذکر کیا وگرنہ اکثر وبیشتر وہ اپنے آپ کو مخفی رکھتے ہیں۔

غالب خود ہی اپنے سوانح نگار تھے، لیکن یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ ان کے معاصرین نے اپنی تحریروں یا یادداشتوں میں ان کے بارے میں بہت ہی کم تفاصیل فراہم کی ہیں۔ غالب کی سوانح کے براہِ راست ماخذ معدوم ہو چکے ہیں۔ جن مؤرخوں کو ان سے استفادہ کا موقعہ ملا انھوں نے ذہانت سے کام نہیں لیا۔ آخری موقعہ پروفیسر حمید احمد خاں نے کھو دیا۔ وہ اس تاریخی لمحے کی اہمیت سے بے خبر تھے کہ وہ غالب

خاندان کی اس خاتون کا انٹرویو کر رہے تھے جنھوں نے چند سال غالب کے گھر بہو بن کر بسر کیے تھے ـــــــ پروفیسر موصوف بڑے نستعلیق قسم کے بزرگ تھے، شدید گرمی میں بھی سوٹ اور ٹائی باندھتے تھے اور یہی وضعداری ان کی بگا بیگم سے ملاقات میں حائل ہوئی۔ انھوں نے ۱۹۳۷ء میں غالب کے متبنی باقر علی خان کی زوجہ بگا بیگم سے ملاقات کی تھی۔ اس گفتگو کا حال دلچسپ لیکن بے ثمر ہے۔ بگا بیگم سات آٹھ سال کے قریب غالب کے گھرانے میں رہیں اور غالب کی وفات کے وقت وہ اٹھارہ برس کے قریب تھیں ـــــــ انھوں نے غالب کو کافی قریب سے دیکھا تھا، لیکن جو معلومات انھوں نے غالب کے بارے میں فراہم کی ہیں وہ کسی اہمیت کی حامل نہیں ہیں۔ البتہ انھوں نے یہ انکشاف ضرور کیا ہے کہ امراؤ بیگم اچھور قسم کی خاتون تھیں غالب بڑھاپے کی بدولت خبطی ہو چکے تھے اور ان کے اپنی بیگم سے تعلقات کھچے کھچے سے تھے۔ پروفیسر حمید احمد خان نے جب بگا بیگم کا انٹرویو کیا اس وقت مؤخر الذکر کی عمر ۹۱ برس کے قریب تھیں تاہم ذہنی اعتبار سے چوکس تھیں ـــــــ پروفیسر موصوف اپنی وضعداری کی بدولت بگا بیگم سے کسی قسم کا کوئی شخصی سوال نہیں کر سکے ـــــــ انٹرویو دینے والے کی شخصیت کے انشراح کا انحصار انٹرویو لینے والے کے سوالات پر ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ پروفیسر نے بگا بیگم کا زیر نظر انٹرویو کسی پلان کے بغیر لیا ہے، یوں پروفیسر موصوف نے حیات غالب کا آخری براہِ راست مآخذ سے استفادہ نہ کر کے غالب شناسی کا نادر موقع کھو دیا۔

اس اطناب کا اجمال یہ ہے کہ غالب کی جملہ سوانح عمریاں ان کی شخصیت کی جملہ حیثیتوں کا احاطہ نہیں کرتیں ہیں۔ تمام سوانح نگار ان کی ادبی حیثیت سے دبے دبے ہوئے ہیں، کسی نے بھی معروضیت سے کام نہیں لیا، اکثر نے سنی سنائی یا غالب کی بتائی باتوں پر اعتبار کیا ہے جس کے نتیجے کے طور پر غالب کی شخصیت کی کلیت مرتب نہیں ہوتی،

ان کی ذات ماں کے عہداوران کی شاعری میں سہ گونہ تعلق قائم نہیں ہوتا۔

دوسری طرف اُردو کے نقادوں نے اس طرح مکھی پہ مکھی ماری ہے کہ غالب پر بے شمار لکھی ہوئی کتابیں اور مضامین ایک ہی قلم کی تخلیق معلوم ہوتے ہیں، اس کی سب سے اہم مثال پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے غالب کی صدسالہ برسی پر چھپنے والی کتابیں تھیں۔ ان مطبوعات میں غالب کی نثری اور شعری تحریروں کو تزک واحتشام سے شائع کیا گیا لیکن جو کچھ تشریحِ غالب میں منظرِ عام پر آیا وہ کافی حد تک افسوسناک ہے، کوئی کتاب اور تحریر غالب کو غالب سے مربوط نہیں کرسکی، کسی ایک نے بھی غالب کی سوانح کو ازسرِنو مرتب کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی ان کی شاعر کو عہد جدید کے حوالے سے دیکھنے کا قرینہ پیدا کیا، پکی ہوئی کھیر سب نے پکائی پھر یونیورسٹی میں غالب چیئر بنائی گئی جو ابھی تک غالب پر تخلیسی تنقید اور جاندار تحقیق کی منتظر ہے۔ ژاں ژینے کو جینے جی ژاں پال سارتر مل گیا تھا اور غالب ابھی تک منتظر ہیں کہ ان کو ان کے اصل روپ میں پہچانا جائے ——

غالبؔ کا کلکتّہ کا سفر

غالبؔ کا کلکتّہ کا سفر کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا یا محض شاعرانہ موج خیال تھا؟ اس معاملہ کی تحقیق کے لیے بعض حقائق کی از سرِ نو تفتیش ضروری ہے۔ حیاتِ غالب میں کلکتہ کا سفر کافی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے حوالے سے ان کی شخصیت کے بعض پہلو سامنے آتے ہیں بعض کہتے ہیں کہ سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے، جو الجھنیں جمود کے باعث پیدا ہوتی ہیں حرکت کے ذریعے دُور ہو جاتی ہیں لیکن غالب اپنے طالع کی نحوست کا شکار تھے، جس کام کو ہاتھ ڈالتے اس کا انجام بُرا ہوتا غالب امید کے سہارے جیتے تھے اور شاید یہی اُمید اُنھیں کشاں کشاں در بدر لیے پھری، انھیں شاید یہ احساس نہیں تھا کہ وہ زندہ رہنے کے لیے جو کچھ کر رہے تھے وہ ان کے شایانِ شان نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنے اور اپنے پیدا کردہ حالات کے ہاتھوں مجبور تھے۔ انھوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ قرض انھیں عارضی نجات دلا سکتا تھا، غالب ایک وبہاڑی دار اجرتی کی طرح زندگی بسر کرتے تھے، اس لیے انھیں فردا کی کوئی فکر نہ ہوتی، وہ قرض لیتے اور پھر اس کا کچھ حصہ چکا دیتے۔ ہر ماہ یہی ہوتا اور غالب کی زندگی گزرتی جاتی۔ لیکن قرض روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اور غالب قرض خواہوں کو یہ جھانسہ دے رہے تھے کہ ان کی پنشن کا حق ملنے والا ہے، اس لیے انھیں صبر کرنا چاہیے۔ عادی قرض دار کی نفسیات عام آدمی کی نسبت

مختلف ہوتی ہے، جھوٹ، تملق، اور وعدہ خلافی اس کی عادت ثانیہ بن جاتے ہیں۔ غالب کی شخصیت بھی ان خصائص سے شاید مبرا نہیں تھی، ان کے مظاہر غالب کی زندگی میں بآسانی تلاش کیے جا سکتے ہیں ـــــ غالب کی شخصیت کی توڑ پھوڑ میں ان کا ماحول برابر کا شریک تھا۔ غالب کے عزیز و اقارب سب کے سب جھوٹی اَنا کا شکار تھے۔ پدرم سلطان بود ایک جھوٹا خواب تھا جسے عملی سطح پر بسر کرنا محض ایک حماقت تھی۔ ستم یہ تھا کہ غالب اور اسی طبقہ کے لوگ اسی حماقت کو قبول کر کے اپنا المیہ تحریر کر رہے تھے۔ یہ عہدِ زوال تھا، یہ عہدِ تداخل تھا، اور ہر کوئی سانس روکے ہوئے دوسرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجموعی اعتبار سے یہ دَور امید سے تہی تھا کہ زمام حکومت ان کے پاس تھی جنھوں نے اس ملک کو بزورِ شمشیر فتح کیا تھا اور جو اپنے آپ کو اعلیٰ تمدن کے نقیب سمجھتے تھے۔

۱۸۲۶ء میں غالب نے یکایک محسوس کیا کہ اب صورتِ حال قابو سے باہر تھی۔ ایک طرف قرضہ کی رقم تیس ہزار روپے تک جا پہنچی تھی، دوسری طرف ان کا بھائی مرزا یوسف بیگ ذہنی توازن کھو چکا تھا، کہیں سے مزید قرضہ ملنے کی اُمید نہیں تھی، خود قلاش، سُسر قلاش، والدہ مقروض اور قلاش، لے دے کر باسٹھ روپے ماہوار پنشن تھی، پُوری کیسے پڑتی؟ غالب کو معًا یہ احساس ہُوا کہ ان کے سُسر کے بھائی نواب احمد بخش نے بددیانتی کر کے ان کے حصّے کی پنشن خواجہ حاجی کے نام کروا دی تھی۔ غالب کا مؤقف تھا کہ خواجہ حاجی ان کے چچا کا وارث نہیں تھا بلکہ ان کے خاندانی سائیس کی اولاد تھا۔ ایک روایت کے مطابق غالب کے چچا نصر اللہ بیگ کی ناگہانی موت کے فوراً بعد خواجہ حاجی اور نواب احمد بخش نے ان کی املاک پر قبضہ کر لیا تھا۔ غالباً اسی خدمت کے معاوضہ کے طور پر نواب احمد بخش نے غالب کی پنشن میں سے ایک حصّہ خواجہ حاجی کے نام لکھوا دیا تھا ـــــ غالب کے لیے مشکل یہ تھی کہ ان کی پنشن بھی نواب احمد بخش کی جاگیر سے آتی تھی، یہ انتظام انگریز حکام نے کیا تھا اور اس فیصلہ

میں نواب احمد بخش کا عمل دخل بھی تھا۔ غالب خود ہی بتاتے ہیں کہ وہ کافی دیر سے نواب احمد بخش سے اپنی پنشن کے بارے میں اصرار کرتے تھے لیکن وہ ٹال مٹول سے کام لیتا تھا۔ غالب کی منطق بھی کچھ عجیب تھی، وہ چارلس مٹکاف سے اپنی دادرسی کے لیے نواب احمد بخش کو وسیلہ بنانا چاہتے تھے۔ اسی مقصد کے لیے غالب نواب احمد بخش کے ساتھ لکھنؤ روانہ ہوئے۔ یہ غالباً ۱۸۲۷ء کی بات ہے۔ غالب نے کلکتے کے سفر کا عزم نہیں کیا تھا اور نہ ہی انھوں نے پریوی کونسل میں پیش ہونے کے لیے متعلقہ دستاویزات ساتھ لی تھیں۔ غالب کسی نہ کسی طرح دہلی سے لکھنؤ کی طرف نکل گئے۔ لیکن وہ تو کلکتہ جانا چاہتے تھے ہ غالب ایک خط میں اس بے راہروی کی وجہ بیان کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ غالب کان پور جاکر بیمار ہو گئے اور بسلسلہ علاج لکھنؤ پہنچ گئے۔ غالب کی علالت کی نوعیت کسی کو معلوم نہیں ہے جس نے غالب کو پانچ ماہ بستر پر لٹاتے رکھا—— غالب کے لکھنؤ میں قیام کی تفصیلات ناپید ہیں۔

ان کے مکاتیب بھی یہاں کچھ راہنمائی کرتے ہیں —— غالب کی یہاں انیس اور ناسخ سے ملاقات ہوئی، وہ نوابانِ اودھ سے داد و دہش کے اُمیدوار تھے، انھیں کچھ نقد رقم ملی بھی لیکن ”درمیانی آدمی“ نے رقم خورد برد کر لی، غالب نے اس کی وصولی کے لیے ناسخ سے رابطہ قائم کیا اور کلکتے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب غالب نے اپنے سفر کا آغاز کیا وہ کم و بیش ۲۹ سال کے تھے اور ان کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیل چکی تھی، اور غالب کو بھی اپنی شہرت پر بھروسہ تھا کہ اس کی بدولت ان کا کام آسان ہو جائے گا۔ غالب کان پور سے باندہ گئے اور وہاں جاکر بیمار ہو گئے اور پانچ ماہ تک صاحب فراش رہے، یہ بیماری کس نوعیت کی تھی، اس کی تفصیلات ناپید ہیں۔ باندہ سے غالب بنارس چلے گئے اور یہاں اُنھوں نے کافی دن قیام کیا، اور بنارس کی ہندو عورتوں کے حسن نے انھیں بے حد متاثر کیا۔ بنارس سے وہ کلکتہ ۲۱۔ فروری ۱۸۲۸ء میں پہنچے۔ کلکتہ میں انھوں نے ایک مکان

دس روپے پر کرائے پر لے لیا اور پھر اپنی مہمات کا آغاز کیا۔ ان میں پہلی مہم انگریز عورتوں کا نظارہ تھا۔ غالب دہلی کے حبس گھٹتے ہوئے سماجی ماحول سے کلکتہ آئے تھے اس کے مقابلہ میں کلکتہ میں انگریز حکمرانوں کی بدولت زندگی بڑی آزادانہ تھی۔ کلکتہ ایسٹ انڈیا کا مرکز تھا، اسی راستے سے مغربی ٹیکنالوجی ہندوستان درآمد کی جا رہی تھی۔ یہ زمانہ انگریزوں کے عروج کا تھا اور فار ایسٹ میں انگریزوں کی مہمات کے لیے رسد کا ایک مرکز کلکتہ تھا۔ غالب کے زمانے میں کلکتہ ایک بین الاقوامی شہر بن چکا تھا جہاں ہگلی میں دخانی جہاز دھواں اگل رہے تھے اور نوآبادیاتی طرزِ تعمیر کی بڑی بڑی عمارتیں سر اٹھا رہی تھیں، یہ بہت بڑا سیاسی اور تمدنی انقلاب ہے۔ غالب نے اس تاریخی عمل کا مشاہدہ کرنے کی بجائے زنانِ فرنگ کے جمال سے لطف اٹھایا۔ غالب نے کلکتہ میں ایک سال کے قریب قیام کیا لیکن اس طویل قیام کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ جہاں تک ان کی پنشن کے قضیے کا تعلق تھا انھوں نے پریوی کونسل میں درخواست گذار دی تھی جہاں کسی قدر لے دے کے بعد یہ فیصلہ ہوا تھا کہ غالب براہِ راست درخواست نہیں دے سکتے، اسے بذریعہ دفتر دہلی معہ سفارشات متعلقہ حکام یہاں پہنچنا چاہیے تھا۔ غالب کی درخواست دہلی بھیجی گئی، اِدھر غالب جواب کے منتظر تھے اُدھر ان کی درخواست دفتری سُرخ فیتے کی نظر ہو گئی تھی، غالب کے وسائل دم توڑ رہے تھے اور صبر بھی ختم ہوتا جا رہا تھا۔ دہلی سے غالب کی عدم حاضری میں دو واقعات رونما ہوئے، اوّل یہ کہ غالب کا مدِمقابل حاجی میاں انتقال کر گیا تھا، دوسرے یہ کہ نواب احمد بخش کے انتقال کے بعد جاگیر اس کے بیٹے نواب شمس الدین نے لے لی تھی۔

کلکتہ میں غالب کے قیام کے دوران ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ پیش آیا، وہ ان کا قتیل کے شاگردوں سے ادبی مجادلہ تھا، یہ وہ لایعنی واقعہ تھا جو ایک تنازعہ کی صورت میں عمر بھر غالب کے اعصاب پر سوار رہا۔ بعد کے ادبی تذکروں میں اس تنازعے کا بہت چرچا رہا، برہانِ قاطع، قاطع برہان اور اس قسم کی بے کار سی کتابیں فریقین نے تحریر کیں۔

اس تنازعہ کی وجہ غالب کی ایک فارسی غزل تھی جو انھوں نے کلکتہ کے ایک مشاعرے میں پڑھی تھی۔ اس کے بعض شعروں پر قتیل کے شاگردوں نے اعتراض کیا تھا کہ انھوں نے مفرد کو مرکب باندھ دیا ہے، اس قسم کے اعتراضات نصابی قسم کے تھے۔ غالب نے جواب میں قتیل کو کھتری بچہ کہہ کر اس کے اشعار کی سند کو رد کر دیا۔ قتیل کے حامیوں نے غالب کو نرغے میں لے لیا۔ غالب گھبرا گئے اور اپنے دوستوں کے مشورہ پر صلح کے لیے ایک مثنوی آشتی نامہ لکھی لیکن اس سے خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا، جب تک غالب کلکتہ میں رہے قتیل کے حمایتی غالب کی مخالفت کرتے رہے۔ تمام عمر یہ واقعہ غالب کے لیے سوہان رُوح رہا اور آخری دم تک قتیل کے حامیوں کو گالیاں دیتے رہے۔ بات صرف انا کی تھی، گو فارسی غالب کی مادری زبان نہیں تھی لیکن ان کو اپنی فارسی دانی پر ناز تھا اور ذرا سے اعتراض سے ان کی انا اتنی مجروح ہوئی کہ یہ واقعہ ان کا جنون بن گیا تھا۔

تخلیقی اعتبار سے بھی غالب کا کلکتہ کا سفر اردو شاعری کے حوالے سے بے ثمر تھا۔ یہ بات تو مسلمہ ہے کہ کلکتہ کے سفر سے قبل غالب اپنی اردو شاعری کا معتد بہ حصہ تحریر کر چکے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سفر کے دوران انھوں نے چند غزلیں اردو میں لکھی تھیں۔ کلکتہ کے قیام کے دوران انھوں نے اپنی اردو اور فارسی شاعری کا انتخاب گُل رعنا کے عنوان سے تیار کیا یا پھر وہ اپنی اردو غزلیات کی نوک پلک سنوارتے رہے، ہو سکتا ہے کہ انھوں نے فارسی میں بھی کچھ لکھا ہو لیکن اردو قارئین کے لیے ان کا یہ کلام عبرانی کی مانند تھا۔

یہ تھیں غالب کی مہمات جو انھوں نے اپنے کلکتہ کے سفر کے دوران سر کیں۔ اتنے پرصعب سفر کا حاصل نئی پریشانیاں تھیں جو غالب کا مقسوم بن چکی تھیں، یہ سارا سفر قرض کے طفیل طے ہوا تھا جسے غالب عمر بھر ادا کرتے رہے۔ غالب کا یہ سفر ڈان کھوٹے کی ایک مہم تھی، یہ ایک موجِ خیال تھی جو غالب کو دہلی شہر سے باہر کھینچ کر لے گئی جہاں وہ ایک

محبوس زندگی بسر کر رہے تھے۔ یکے بعد دیگرے سات بچوں کا مرنا، بھائی کا پاگل ہونا، ایک مقروض کی ڈھیٹائی کے ساتھ زندگی بسر کرنا حیاتِ غالب کے تکلیف دہ واقعات تھے۔ ان سے فرار ضروری تھا۔ ستم یہ ہے کہ اس فرار نے غالب کو تر و تازہ کرنے کی بجائے پہلے سے بھی زیادہ مضمحل کر دیا۔ کلکتہ کے سفر کے دوران غالب کو برطانوی ہندوستان دیکھنے کا موقعہ ملا، انھوں نے ایک متزلزل حکومت کا مشاہدہ بھی کیا لیکن ان کی متخیلہ حرکت میں نہ آئی اور نہ ہی ان کی تخلیقات کا رنگ بدلا۔ زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اتنا کچھ دیکھنے کے بعد بھی غالب اپنے سفر اور اپنے تجربات کے بارے میں گم سُم رہے۔ غالب کا کلکتہ کا سفر صرف ایک موجِ خیال تھا۔ ایک عارضی فرار تھا۔ ایک شخص جو حق رسی کے لیے دور دراز کا تکلیف دہ سفر کرتا ہے اپنا اصلی ہدف بھُول کر شعر و شاعری اور ادبی مجادلوں میں مصروف ہو جاتا ہے، ایسے شخص کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے؟

غالب کی علالت

غالب کی علالت کو ان کے نفسیاتی فریم ورک سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ غالب کی علالت ڈور رس معنویت کی حامل تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد غالب اپنے مکاتیب میں اپنی علالت کا تذکرہ بڑے تواتر سے کرتے ہیں۔ غالب نے اپنی علالت کی جو تفصیل بیان کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی بڑے عارضے میں مبتلا نہیں تھے۔ غالب ضعفِ بصارت، ضعفِ نسیاں، ضعفِ سماعت دورانِ خون اور پیٹ کے متعدد عارضوں میں مبتلا تھے، ان میں سے کوئی عارضہ بھی ایسا نہیں تھا جس سے غالب کی زندگی کو موت کا فوری خطرہ لاحق ہوتا۔ صفیر بلگرامی غالب سے اپنی ملاقات کے حال میں لکھتے ہیں کہ آخری عمر میں ان کی سماعت بالکل ختم ہو چکی تھی، بینائی میں بھی فتور تھا، ان کے ہاتھ پاؤں کی انگلیاں سوجھ کر اینٹھیں ہوئی تھیں، غالباً یہ کثرتِ مے نوشی کا نتیجہ تھا۔ غالب تا دمِ مرگ مے نوشی کرتے رہے اگرچہ ان کے بیان کے مطابق، شراب کی ایک معین مقدار سے وہ تجاوز نہیں کرتے تھے لیکن یہ ایک ڈھکوسلہ معلوم ہوتا ہے۔ پچاس سال کی مسلسل شراب نوشی نے غالب کے حواس کو بُری طرح متاثر کیا تھا۔ قوتِ ارادی کی کمی، رعشہ، دَورانِ خون میں جوش اسی کا نتیجہ تھے۔ ۱۸۵۷ء میں غالب کی عمر ۶۰ برس تھی، ان کی تخلیقی صلاحیت بالکل ختم ہو چکی تھی، جسم وجاں زوال پر تھے، خانگی زندگی سرد مہری کا شکار تھی، اولاد سے محرومی اور ذرائع آمدن کی کمی نے انھیں اَدھ مویا کر دیا تھا۔ غالب کا جسمانی اور ذہنی انحطاط بتدریج

تھا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ عمل تیز ہوتا گیا - کچھ ایسے واقعات تھے جو ان کی دسترس سے باہر تھے اور کچھ ان کے پیدا کردہ تھے ۔ یہ ایک ایسا جنجال تھا کہ جس سے وہ باہر نہیں نکل سکتے تھے - انھوں نے اپنی خانگی زندگی کا جو پیٹرن بنایا تھا - وہ کافی حد تک ان کی بربادی کا ذمہ دار تھا ۔ بقول غالب ان کی آمدنی ۱۶۳ روپے تھی اور ان کا خرچ ۳۰۰ روپے ماہوار تھا ۔ ظاہر ہے کہ غالب ایسے بے روزگار اور بے جائیداد شخص کے لیے ۱۵۰ روپے زائد کمانا ناممکن تھا ۔ انھیں لامحالہ ساہوکاروں کی بھینٹ چڑھنا تھا وہ اپنے نصف درجن ملازموں کو برطرف کر سکتے تھے ، اور ایسے ملازم رکھنے سے بھی کیا فائدہ تھا کہ غالب ان کی تنخواہوں میں سے بھی قرض لے لیتے تھے ۔ اسی طرح اگر وہ عارف کے بیٹوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر نہ لیتے تو ان کی گزر اوقات ہو سکتی تھی ، لیکن غالب ایک المیہ ہیرو تھے جو شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی مشکلات میں اضافہ کرتے رہتے ، اور جب کسی چکر میں الجھ جاتے تو پھر شومئی قسمت اور ناقدریٔ زمانہ کا شکوہ کرنے لگتے ۔ غالب درباری روایت کے شاعر تھے جو ہمیشہ داد و دہش اور توقع پر جیتے تھے ۔ اس طرزِ معیشت سے جو ذہنی فریم ورک تیار ہوتا ہے غالب اس سے مستثنیٰ نہیں تھے —— مغلیہ دربار اجڑنے کے بعد غالب کا تباہ حال ہونا ایک لازمی نتیجہ تھا ۔ وہ ۶۱ سال کی عمر میں اپنی معیشت کا نیا ذریعہ بنانے سے مجبور تھے ۔ دوسری طرف ساری عمر صرف شعر گوئی کے علاوہ انھوں نے کوئی دوسرا کام بھی نہیں کیا تھا اور وہ اپنی موجودہ صورتِ حال پر قناعت کرنے پر آمادہ بھی نہیں تھے ۔ ان حالات کے نتیجہ کے طور پر بے بسی اور شکست قبول کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا چنانچہ غالب کی ڈی جنریشن ایک لازمی نتیجہ تھا ۔ غالب اگر واقعی بے حد علیل رہتے تو ایک دو سالوں میں انجام کو پہنچتے لیکن اس کے برعکس وہ ۱۲ سال کے طویل عرصہ تک اپنی خواہشِ زیست کے خلاف جنگ کرتے رہے :

۱۸۵۶ء —— افسوس ہے کہ میرا حال اور یہ لیل و نہار آپ کی نظر میں نہیں ہیں ،

ورنہ آپ جانیں کہ اس بجھے ہوئے دل اور اس ٹوٹے ہوئے دل پر کیا کر رہا ہوں۔

۱۸۵۹ء ——— اب تو روز و شب اس فکر میں ہوں کہ زندگی یوں گزری، اب دیکھیے موت کیسی ہو۔

۱۸۵۹ء ——— یہاں فارسی کیا لکھوں یہاں ترکی تمام ہے، اخوان و احبا یا مفقود یا مفقود الخبر، ہزاروں کا ماتم دار ہوں، آپ غم زدہ اور آپ غمگسار ہوں، اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں، مرنا سر پر کھڑا ہے۔

۱۸۶۰ء ——— پایانِ عمر ہے، دل و دماغ جواب دے چکے ہیں۔

۱۸۶۱ء ——— دریا سارا تیر چکا ہوں، ساحل نزدیک ہے، دو ہاتھ لگاتے بیڑا پار ہے:

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا۔

۱۸۶۶ء ——— پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرہ، ضعف بصارت، ضعفِ معدہ، ان سب ضعفوں پر ضعفِ طالع . . . . .

غالب کے مکاتیب میں اس قسم کے بہت سے اقتباس ہیں جن میں غالب نے اپنی علالت قوتِ مدافعت کے تدریجی زوال، خواہشِ زیست بجھ جانے کا تذکرہ بڑی دردانگیزی سے کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۸۵۷ء کے بعد کے مکاتیب کے اختتام پر غالب بار بار مرگ کا طالب عفو کا طالب۔ بڑے تواتر سے لکھتے ہیں ہر سال اپنی موت کی فال نکالتے ہیں۔ بار بار زندگی سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ بڑھاپے میں زندگی ان کے لیے ایک سزا بن گئی تھی اور وہ موت کے طلب گار تھے۔ یہ بڑھاپے میں غالب کی شخصیت کا ایک روپ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلسل مالی تنگی نے غالب میں ایک طرح کی خود ترحمی پیدا کر دی تھی اور وہ خود بھی یہ تاثر پیدا کرتے تھے کہ ہر سطح پر ان کے ساتھ

ناانصافی ہو رہی ہے، حالات اور ان کا مقدر انھیں نابود کرنے کے درپے ہیں۔ اِدھر بیماریوں نے انھیں نرغے میں لیا ہُوا تھا۔ ان کا مسئلہ مالی تنگی کی بجائے فقدانِ راحت تھا۔ جس کی خاطر اُنھوں نے اپنی ذات اور عزت سب کچھ چھوٹے چھوٹے مہاجنوں اور نوابوں کے پاس گروی رکھ دیا تھا، ان کی ذات میں ایک بڑے فن کار کا حشم ناپید تھا۔ اس میں صرف غالب کا قصور نہیں تھا، ان کی پرورش ایسی فضا میں ہُوئی تھی جہاں اعلیٰ اقدار کا فقدان تھا، جہاں ہاتھ پاؤں توڑ کر پنشنوں پر گزارہ کرنے کا دستور تھا، جہاں شاندار ماضی کا حال کی زبوں حالی سے تقابل کرنے کا رواج تھا۔ غالب اور اس طبقہ کے دوسرے لوگ ایسی صُورتِ حال کی دلدل میں رہنے میں مریضانہ لذت محسوس کرتے تھے۔ غالب کی خود ترحمی اور اپنی عظمت کا بلند بانگی سے اعلان دو متضاد رویے ہونے کی بجائے ایک ہی مغلوب اور عدم تحفظ کی شکار سائیکی کے مظہر تھے۔ غالب نے اپنی جسمانی علالت کے جو مرقع بنائے ہیں ان میں صرف تنہائی ایک المیے کی صُورت میں نمودار ہوتی ہے۔ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ان کی علالت زیادہ خطرناک نہیں البتہ بڑھاپے کا ضعف اُنھیں پریشان کرتا ہے۔ وہ بار بار لکھتے ہیں کہ انھیں شعر و شاعری اپنے آپ سے ہر چیز سے نفرت ہو چکی ہے اور اب موت ہی اُنھیں زندگی کے جھنجھٹ سے نجات دلا سکتی ہے۔ اس رویّہ کے برعکس ۱۸۶۰ء کے بعد غالب نے جو مکاتیب لکھے ہیں ان میں ان کی ادبی مصروفیات اسی طرح جاری تھیں، وہ اپنی تصاویر کھینچوانے اور ان کی فروخت، اور کتابوں کی اشاعت میں مصروف تھے۔ وہ اپنی ناطاقتی کے باوجود ۷۰ برس کی عمر میں مشکلات کا سامنا کرتے ہُوئے رامپور جا پہنچے۔ اسی طرح ۱۸۶۵ء میں اُنھوں نے دہلی سوسائٹی کے اجلاس میں نہ صرف شرکت کی بلکہ دہلی کی تباہی کے بارے میں ایک مختصر سا مضمون بھی پڑھا۔ ان وقائع سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب کی علالت اتنی شدید نہیں تھی کہ وہ اٹھنے بیٹھنے سے لاچار ہوتے۔ حقیقت میں غالب کا تخلیقی سرچشمہ خشک ہو چکا تھا، ان

کی فارسی شاعری کا کوئی سامع نہیں تھا، وہ جس قسم کی زندگی بسر کر رہے تھے وہ تخلیقی عمل کے منافی تھی، انفرادی اور اجتماعی سطح پر ایک طرح کے احساسِ جرم اور احساسِ شکست کا در آنا لازمی تھا، غالب اپنے اندر اس روئیدگی کے عمل سے بے خبر تھے۔

غالب کی علالت دراصل ایک پورے عہد کی ذہنی اور روحانی علالت تھی، یہ ان معنی میں مابعدالطبیعاتی علالت تھی۔ یہ اعلیٰ انسانی اقدار سے تہی پورے نظام کے سسک کر مرنے کے عمل کی علامت تھی، غالب کا جسمانی اور ذہنی اضطراب ایک عہد کے نیم مردہ شعور کا مظہر تھا جس کی صورتِ حال کچھ اس قسم کی تھی: ایک چرخ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے، جو ہونا ہے وہ ہُوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے، کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے ..... مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید، نہ رنجور ہوں نہ ناخوش نہ مردہ ہوں نہ زندہ، جیئے جاتا ہوں، باتیں کیے جاتا ہوں، روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہے گاہے پیے جاتا ہوں۔ موت آئے گی مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت ——————

جُوں کی تُوں صورتِ حال، کچھ نہ کرنے کی خواہش، کسی اُمنگ کے بغیر زندگی، انفرادی اور معاشرتی، تنہائی، خوف، عُسرت، اور ان واقعات کے درمیان اپنی عظمت اور اَنا کا اعلان غالب کی سرگزشت میں ان کی اور ان کے عہد کی ذہنی اور روحانی علالت کا ثبوت ہے۔ اصل میں غالب اپنی ذہنی اور جسمانی علالت میں ایک بے ثمر عہد کے ضعف کو بسر کر رہے تھے۔ اس سے باہر نکلنا ناممکن تھا، اسے البتہ کسی مصالحتی فارمولے کے تحت بسر کیا جا سکتا تھا۔ یہی غالب نے کیا۔

(۲)

کیا غالب "میگیلومینیا" کے مریض تھے؟ یہ سوال غالب کے احوال میں کافی اہم ہے کیونکہ ان کی زندگی کے واقعات مخالف سمتوں میں سفر کرتے ہُوئے دکھائی

دیتے ہیں۔ ان کے قول وفعل میں تضاد تھا، وہ اپنے بارے میں ہر بات میں مبالغہ سے کام لیتے تھے، کبھی کبھار جھوٹ سے بھی کام لیتے تھے، اور اپنی ذاتی اور نجی تفاصیل کے بیان میں تضاد کا شکار بھی تھے۔ مثال کے طور پر وہ اپنے کلکتہ کے سفر کے بارے لکھتے ہیں کہ قرض خواہوں نے ان کے ناک میں دم کیا ہوا تھا اور ان کا باہر نکلنا محال تھا چنانچہ لکھتے ہیں "دوسروں کی نظر سے چوری چھپے بھیس بدل کر کسی قسم کا ساز وسامان لیے بغیر روانہ ہوگیا" لیکن ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ وہ نواب الٰہی بخش کے ساتھ دہلی سے روانہ ہوئے تھے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر چوری چھپے بھیس بدل کر دہلی سے باہر نکلنے کی بات بے وزن ہو جاتی ہے۔ اسی طرح غدر کے دوران وہ بربادی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کے مسودات اور تمام کلام تلف ہو گیا تھا لیکن ایک سے زیادہ مرتبہ لکھتے ہیں کہ ان کا تمام کلام نواب ضیاء الدین کے پاس جمع رہتا تھا۔ غالب کے اردو اور فارسی کلیات غدر سے پہلے چھپ چکے تھے اس لیے ان کے کلام کا تلف ہونا بے معنی سی بات ہے جب کہ غدر کے بعد غالب نے دو تین اردو غزلیں لکھیں۔ غالب کی سوانح میں اس قسم کے تضادات کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خود اپنی سوانح کے راوی تھے اور شعوری طور پر بہت سی بات میں ابہام پیدا کرتے تھے کیونکہ وہ اپنی خارجی زندگی کو ایک خصوصی ڈیزائن کے تحت مرتب کرنا چاہتے تھے، اس اعتبار سے وہ ایک "ڈینڈی" تھے، وہ بیک وقت ایک تماشا اور تماشائی بننا چاہتے تھے۔

غالب کا عہد قلاش نوابوں سے بھرا ہوا تھا جو اپنی معیشت کے لیے انگریزوں کے دست نگر تھے، اور اس محتاجی کے باوجود وہ اپنی ظاہری ٹیپ ٹاپ کو ہر صورت میں برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ یہ نواب تیسرے درجہ کے شاعر بھی تھے جو اپنے اندر کسی طرح کی ادبی مسابقت کا جذبہ نہیں رکھتے تھے کہ شاعری یا ادب ان کی زندگی کا بنیادی محرک نہیں تھا۔ غالب کا معاملہ ان سے مختلف تھا، وہ اعلیٰ درجے کی تخلیقی صلاحیتوں

کے مالک تھے، اور بچپن سے ہی شاعری کی طرف راغب تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مروجہ اسلوبِ شعر میں امتیاز حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ چنانچہ انھوں نے شاعری کو اپنی ذات کے اثبات اور اپنی شخصیت کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ شاعری کا تعلق تو ہنر کے ساتھ تھا لیکن شخصیت تو ان کی ذات کا خارجی پہلو تھا اور جس کے ترفع کے لیے ایسے خارجی عناصر کی ضرورت تھی جن کا تعلق شاعری سے نہیں تھا۔ چنانچہ غالب نے اپنی تحریروں میں بڑے اہتمام سے اپنے آپ کو نواب ثابت کرنے کی کوشش کی، اسی حوالے وہ اپنی شناخت میں مسرت محسوس کرتے تھے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ غالب کے رشتہ دار مانگے تانگے کے نواب تھے اور غالب نے بہ وجوہ یہ نوابی مستعار لی تھی، اسی کی ایک وجہ نفسیاتی تھی اور دوسری عملی۔ غالب "میگیلومینیا" کے مریض تھے اور وہ اپنے عوامل میں حشم دیکھنا چاہتے تھے۔ "سنو میری جان! نوابی کا مجھ کو خطاب ہے نجم الدولہ" اطراف و جوانب کے امرا سب مجھ کو نواب لکھتے ہیں، بلکہ بعض انگریز بھی۔۔۔ لیکن یہ یاد رہے، نواب کے لفظ کے ساتھ "مرزا"، یا "میر" نہیں لکھتے، یہ خلافِ دستور ہے۔ یا "نواب اسد اللہ خاں" لکھو یا "مرزا اسد اللہ خاں"، لکھو اور بہادر، کا لفظ دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔ (۱۸۵۸ء) ۔ جو شخص نواب نہ ہو اور نوابی کے لقب سے مسرت محسوس کرتا ہو اس کا ذہنی فریم ورک ذات میں بعض کمیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ غالب ابتدا ہی سے عدم تحفظ کا شکار تھے، یتیمی اور ناداری میں پرورش پانے والے نابغہ ذہن نے اپنے تحفظ کے لیے ایک ایسا دفاعی نظام تیار کیا تھا کہ اس کے معاصرین اس کی ذات کی کنہ تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ برتری، حشم، اور تنک مزاجی غالب کی شخصیت کے تین روپ تھے۔ شاعری میں غالب کی برتری مسلم تھی، دہلی میں ان کے معاصر شعرا ادنیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے، لکھنؤ میں میر انیس ایسا نامور شاعر تھا لیکن وہ مرثیہ میں اپنے شاعرانہ حشم کا مظاہرہ کر رہا تھا، اس سے غالب کی چشمک یا مسابقت کا امکان نہیں تھا ـــــ اپنے معاصرین میں

غالب کا احساسِ برتری بے جا نہیں تھا۔ غالب اپنے ادبی احساس تفخر کو اپنے حشم کے تصور سے متصل کرنا چاہتے تھے۔ ذوق دوسرے درجے کا شاعر تھا مگر دربارِ دہلی کا ملک الشعرا تھا، اور ایک مدت سے اس کی جگہ لینے کے لیے غالب بے چین تھے، وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اس عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے اور ملک الشعراء کا اعزاز ان کا حق تھا۔ ذوق کی وفات کے بعد ان کی اُمید بر آئی۔ لیکن یہ ایک عارضی اعزاز تھا، تاہم غالب کی اس تعیناتی سے شہرت اور عزت میں اضافہ ہُوا۔ قبل ازیں غالب دربار اودھ اور ملکہ وکٹوریہ کے دربار سے منسلک ہونے کی کوششیں کر چکے تھے۔ یہ عوامل اگر ایک طرف اپنی آمدنی بڑھانے کا ذریعہ تھے تو دوسری طرف وہ اپنی شخصیت کے گرد شکوہ کا ہیولی تعمیر کر رہے تھے۔ دہلی کالج میں ملازمت کے قصّے کو بھی اسی حوالے سے دیکھا جانا چاہیے۔ یہ ہرگز اَنا کا مسئلہ نہیں تھا۔ غالب انگریز حاکم سے اپنی پذیرائی کے ڈرامے کے ذریعے اپنا معاوضہ بڑھانا چاہتے تھے۔ یہ معاوضے کا مسئلہ ہی تھا کہ مومن خان مومن نے بھی اس ملازمت کو مسترد کو دیا تھا۔ غالب کی اَنا صرف ان کی شاعری تک محدود تھی ورنہ عام زندگی میں ان کا رویہ کچھ اتنا معزز نہیں تھا۔ انگریز حکام سے غالب کا تعلق اور دربار رام پور سے غالب کی وابستگی اور ان کی تحقیر کی داستان دردناک ہے۔ اس پرخلش احساس سے محفوظ رہنے کے لیے غالب ناقدری روزگار کی شکایت کرنے لگتے۔ غالب ہمیشہ اتھارٹی سے منسلک ہونے کی کوشش کرتے اور ہمیشہ یہی تأثر دیتے۔ کہ ان کی ہر جگہ پذیرائی کی جاتی ہے۔ حقیقت حال اس سے مختلف تھی ـــــ انگریز حکام بعض اُوقات ان سے ملاقات سے گریز کر جاتے، اگر ان سے ملتے بھی تو ان کی معروضات کی طرف توجہ نہ دیتے، لیکن غالب اپنے خطوں کے ذریعے ہمیشہ یہی تأثر دیتے کہ ان کے حکام سے بڑے دوستانہ تعلقات ہیں۔ یہ خود فریبی نہیں تھی، یہ صاحبانِ اقتدار کے ساتھ تعلق کی خواہش تھی کہ سب یہ جان جائیں کہ غالب ایک اہم شخصیت ہے جس کی

اٹھک بیٹھک اعلیٰ تمدن کے حامل لوگوں سے ہے۔

دوسری طرف ذاتی سطح پر بھی یہ ضروری تھا کہ غالب طمطراق کے ساتھ زندگی بسر کریں ـــــ برتری، حشم اور انفرادیت کے لیے اعلیٰ لباس، اعلیٰ رہائش اور نوکر چاکروں کی ضرورت تھی۔ غالب پیچھے رہنے والے نہیں تھے، انھوں نے ایک نواب طرح زندہ رہنے کا تہیہ کیا ہُوا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی رہائش کے لیے دو حویلیاں کرالیے پر لی ہُوئی تھیں، ایک میں خود رہتے تھے اور اسے دیوان خانہ کہتے تھے، دوسری حویلی میں ان کی بیگم رہتی تھی اسے وہ محل سرا کے نام سے یاد کرتے تھے۔ غالب نے ایک طرح کی "شیڈو گورنمنٹ" بھی بنائی ہُوئی تھی۔ ان کا ایک ملازم دیوان کا فریضہ ادا کرتا تھا، دوسرا داروغہ کے منصب پر فائز تھا، دو تین کہار تھے، ایک آدھ باورچن تھی۔ حویلی کے باہر کچھ فقیر بھی بیٹھے رہتے۔ اندرون خانہ وہ مقوی خوراک کھاتے تھے اور کبھی دوسرے کو کھانے کی دعوت نہیں دیتے تھے، ہر وقت شراب کی معقول تعداد ان کے بکس میں موجود رہتی۔ یہ طور طریقے ایک مرفعہ حال شخص کے ہونے چاہئیں۔ غالب ایک قلاش شخص تھے اور اپنی اس وضع کو قائم رکھنے کے لیے ہر طرح کے پاپڑ بیلتے، میکفرسن انگریز شراب فروش نے ادھار شراب کے عوض عدالت سے ڈگری لے لی، ادھر جوا کے دو مقدمات ان پر قائم ہُوئے لیکن غالب نے اپنا طریقِ زندگی نہ بدلا۔ وہ خود اپنی خواہشوں کے اسیر ہو چکے تھے۔ ان کے نزدیک وہ ایک نواب تھے اور اس کے حشم کو ہر طور برقرار رکھنا ضروری تھا۔ نفسیات کی رو سے میگیلو مینیا کا مریض ہمیشہ عظمت اور برتری کے سراب میں زندہ رہتا ہے، وہ اپنی ذات کو مبالغہ کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔

شاعری میں تعلی اُردو شعرا کے یہاں ایک عام سی بات ہے۔ غالب کے کلام میں بھی تعلی موجود ہے لیکن ان کا طریقہ بالواسطہ تھا۔ انھیں یقین تھا کہ وہ ہندوستان

میں فارسی زبان کے سب سے بڑے شاعر تھے، اور اپنے اردو کلام کو ننگ سے تعبیر کرنا بھی تعلی کی ایک صورت تھی۔ وہ اپنے معاصرین میں بھی کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ غالب نے اپنے اُردو کلام میں فارسی اور اردو کے امتزاج سے جو لسانی شیلوہ مخترع کیا تھا وہ بھی ایک طرح کے شکوہ کا حامل ہے۔ غالب کو اپنے فن کی عظمت کا یقین تھا لیکن وہ جس طرح اس کی تشہیر کرتے تھے وہ ان کی عظمت کے منافی تھا۔ پنج آہنگ کی اشاعت کے دوران انھوں نے اس کی پبلسٹی کے لیے ایک منظوم اشتہار لکھا:

منطبع ہو رہی ہے پنج آہنگ گل و ریحان

منطبع ہو رہی ہے پنج آہنگ

گل و ریحان و لالہ رنگا رنگ

نہیں اس کا جواب عالم میں

نہیں، ایسی کتاب عالم میں

تھے ظہوری و عرفی و طالب

اپنے اپنے زمانے میں غالب

نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے

اسداللہ خاں غالب ہے

ٹ

چار سے بیچ نہ ہو گی کم قیمت

اس سے لیویں گے کم، نہ ہم قیمت۔

یہ بظاہر ایک اشتہار تھا لیکن جو کچھ غالب کے تحت الشعور میں تھا، وہ عیاں ہے

غالب کا زمانہ پُر آشوب تھا۔ ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ مشاعرے وغیرہ ختم ہو چکے تھے۔ اس لیے شعر و شاعری نجی محافل تک محدود ہو چکی تھی۔ پریس کی آمد سے نشر و اشاعت کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ غالب نے اپنے اردو دیوان کا پہلا ایڈیشن اپنی گرہ سے ۵۰۰ روپے خرچ کر کے ۵۰۰ کی تعداد میں شائع کرایا تھا۔ اس سے غالب کی شہرت میں اضافہ ہوا تھا۔ اردو اور فارسی شاعری میں غالب کی شہرت کی ایک وجہ ان کی مشکل پسندی اور شاعرانہ بوالعجبی تھی۔ نصر اللہ بیگ اور الٰہی بخش سے وابستگی نے غالب کو معاشرتی سطح پر بھی شہرت دی تھی۔ وہ کھلم کھلا شراب بھی پیتے تھے اس لیے رند بھی کہلاتے تھے۔ ان تمام مثبت اور منفی واقعات کے باوجود غالب نے یہاں کی ادبی دنیا میں ایک نام کمایا تھا جس کی حفاظت وہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب انھیں گورنر جنرل کے دربار میں آخری قطار میں نشست ملی تو غالب کو بے پایاں رنج ہوا:

کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام
فرمانروای کشورِ پنجاب کو سلام

....

اخبارِ لودھیانہ میں میری نظر پڑی
تحریر ایک جس سے ہوا بندہ تلخ کام
ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر
کاتب کی آستیں مگر تیغ کا نیام
وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
جب یاد آگئی ہے، کلیجہ لیا ہے تھام
سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
نمبر رہا نہ نذر نہ خلعت کا انتظام

ستر برس کی عمر میں یہ داغِ جانگداز
جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام
اس بزم پر فروغ میں اس تیرہ بخت کو
لمبر ملا نشیب میں از رُوئے اہتمام
سمجھا اسے گراب ہُوا پاش پاش دل
دربار میں جو مجھ پہ چلی چشمک عوام
عزت پہ اہلِ نام کی ہستی کی ہے بنا
عزت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی نہ نام
خود ہے تدارک اس کا گورمنٹ کو ضرور
بے وجہ کیوں ذلیل ہو غالب جس کا نام

غالب کا یہ غم و غصہ بجا بھی تھا اور بیجا بھی۔ اس قصیدے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۶۷ء کو دہلی ریلوے سٹیشن کا افتتاح ہُوا تھا اور گورنر میکلوڈ نے جمنا کے کنارے دربار کیا تھا ـــــــ غالب اپنی بیماری اور ناطاقتی کے باوجود اس غرض سے دربار میں گئے تھے کہ مشہور شاعر اور برادر زادہ جاگیردار ہونے کے ناطے ان سے ترجیحی سلوک کیا جائے گا، لیکن غالب کا یہ بھرم ٹوٹ گیا جب انھیں دربار میں آخری نشست پر جگہ دی گئی۔ یہ غالب کی حقیقت حال تھی جسے وہ جیتے جی قبول نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ حشم، برتری اور انفرادیت کے سراب میں رہتے تھے۔ غالب عمر بھر اس سراب میں قید رہے اور اس سے باہر نکلنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

یہ ان کا شیشے کا گھر تھا جس میں وہ اپنی شبیہہ کو ہر طرف منعکس

دیکھ کر مسرت محسوس کرتے تھے۔ غالب کو "میگیلو مینیا" کی ضرورت تھی، وہ حکمرانوں پر اپنی اعلیٰ نسبی ثابت کرنا چاہتے تھے اور دوسری طرف اپنے معاصرین سے اپنی فنکارانہ عظمت کا اعتراف چاہتے تھے۔

غالب کی ازدواجی زندگی

غالب کی ازدواجی زندگی کے بارے میں تفتیش کرنا تفہیمِ غالب کے دائرہ کو وسیع کرنا ہے۔ ثقہ قسم کے لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں غالب کی ازدواجی سے کوئی سروکار نہیں ہے، ہم ان کی شاعری کا حال جاننا چاہتے ہیں، یہ مطالبہ اپنے طور پر حق بجانب ہے لیکن ایک فن کار کی تخلیقی شخصیت سے اس کی ذاتی زندگی کو منہا نہیں کیا جا سکتا۔ کرکیگار کی ریجنا سے محبت نے اس کے فلسفہ کو متأثر کیا، دوستوفسکی کی ذاتی زندگی اس کے ناولوں کا موضوع بن گئی —— فن کار اپنے لیے اور دوسروں کے لیے ایک واقعہ ہوتا ہے، وہ اپنی ذات کے حوالے سے خارجی دُنیا کا وقوف پاتا ہے۔ اس طرح وہ لیے بھی ایک غیر ذات بن جاتا ہے۔ غالب ایک دلچسپ شخصیت کے حامل تھے۔ ڈاکٹر لطیف کا خیال ہے کہ ان کی شخصیت اور ان کی تخلیقات ایک دوسرے سے غیر مربوط تھے۔ ڈاکٹر لطیف کا یہ مشاہدہ محلِ نظر ہے۔ غالب کی شخصیت کا ابھی تک BEHAVIOURISTIC نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا گیا ہے لیکن ان کے ظاہری عوامل کے پس منظر میں جو محرکات تھے انھیں نظر انداز کیا گیا ہے غالب جس عہد میں زندگی بسر کر رہے تھے اس میں شخصیت کا مربوط ہونا ایک ناممکن سی بات تھی۔ تاہم غالب بطور ایک انسان اور غالب بطور شاعر میں بہت زیادہ فرق تھا، غالب نے ان دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ غالب شاعر کے بہت سے مطالبات تھے جنھیں غالب بطور فرد پُورا نہیں کر سکتا تھا۔ غالب ایک کمزور شخصیت

کے مالک تھے اور وہ اپنی انا کو برقرار نہیں رکھ سکتے تھے اس لیے وہ ایک دوسرے کا تضاد بن کر زندگی بسر کرتے رہے۔ بہرکیف ان کی زندگی کے بہت سے واقعات ہیں جن کے اثرات کو ان کی شاعری میں مختلف رنگوں میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

غالب اور ان کی بیگم امراؤ کے تعلقات کو غالب کی سوانح میں زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ ان کے تمام سوانح نگاروں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان دونوں کے تعلقات بڑے ہموار تھے اور دونوں آپس میں ایک خلوص اور محبت کے ساتھ رہتے تھے۔ غالب کی نجی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات درج ہیں، تاہم مکاتیب غالب اور متفرق سوانحی مواد میں ان کی ازدواجی زندگی کے بارے میں ایسے اشارے موجود ہیں جو دونوں میں اختلاف کا ثبوت فراہم کرتے ہیں: "اکثر امور میں تم کو اپنا ہم طالع پاتا ہوں عزیزوں کی ستم کشی اور رشتہ داروں سے ناخوشی میرا ہم قوم تو سراسر قلمرو ہند میں نہیں۔۔۔ سو پانچ برس کی عمر سے ان کے دام میں اسیر ہوں، اکسٹھ برس ستم اٹھائے ہیں۔۔۔۔۔ ۱۸۶۱ء" ظاہر ہے کہ یہاں غالب کا اشارہ اپنے ننھیال اور سسرال کی طرف ہے جن کا بچپن میں غالب سے رویہ کچھ اتنا مشفقانہ نہیں تھا۔ ان کے اس مکتوب سے ان کے سوانح نگاروں کا یہ مفروضہ ہوا میں اُڑ جاتا ہے کہ ننھیال میں غالب کی زندگی بڑے مزہ سے گزرتی تھی۔ لوہارو خاندان اگر چاہتا تو غالب کی بعض مشکلات کم ہو سکتی تھیں لیکن اس کا غالب سے رویہ لاتعلقی اور خنکی کا تھا۔ غالب کے سسر نے بھی کبھی ان کی حمایت نہیں کی تھی، اسی طرح علی بخش رنجور جو تمام عمر غالب سے چمٹا رہا اس نے بھی ان کی حمایت میں کچھ نہ کہا اور کہتا بھی کیونکر وہ خود احمد بخش کا وظیفہ خوار تھا۔

یہ وہ خاندانی محرکات تھے جنھوں نے غالب کو اس خاندان سے رنجیدہ رکھا۔ امراؤ بیگم بھی اسی خاندان سے تھیں اور غالب انھیں شعوری یا غیر شعوری سطح پر معاف کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے، غالب روپے پیسے کے معاملے میں کسی کو معاف نہیں کرتے

تھے ۔ ایسی کوئی شہادت موجود نہیں ہے جس کے پیشِ نظر یہ کہا جاسکے کہ غالب کے سسر، علی بخش رنجور یا امراؤ بیگم نے احمد بخش سے غالب کی حق رسی کی کوشش کی ہو۔

اس خاندانی رنجش سے قطع نظر غالب اور امراؤ بیگم میں طبیعی اختلاف بھی تھا۔ غالب نے اپنی رہائش دو حویلیوں میں رکھی ہوئی تھی، جب بھی وہ مکان بدلتے تو اپنی رہائش ایک۔ دوسری حویلی میں رکھتے جسے وہ دیوان خانہ کہتے اور دوسری حویلی جس میں امراؤ بیگم رہتی اسے وہ محل سرا سے یاد کرتے۔ غالب نے اپنی رہائش علیحدہ کیوں رکھی تھی اس کی وجہ نامعلوم ہے تاہم غالب کی مصروفیات کچھ اس قسم کی تھیں کہ کوئی خاتونِ خانہ اسے برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ جوا کھیلنا، گھر میں شراب کشید کرنا اور دوستوں کے ساتھ گپ بازی کی طویل نشستیں... وہ مصروفیات تھیں جو غالب کی خانگی زندگی کے سکون میں حارج تھیں۔ غالب شراب نوشی کے بے حد شائق تھے لیکن امراؤ بیگم عبادت گذار تھیں، ایک روایت کے مطابق امراؤ بیگم نے غالب کے برتن علیحدہ کر دیے تھے۔

امراؤ بیگم کے بارے میں سب یہی جانتے ہیں کہ غالب کی وفات کے بعد امراؤ بیگم مالی مشکلات کا شکار ہو گئی تھیں۔ غالب کی وفات کے بعد پنشن بند ہو گئی تھی۔ اس نے پنشن کے اجرا کے لیے بہت تگ و دو کی لیکن صرف دس روپیہ مہینہ مقرر ہوئی جو امراؤ بیگم نے اس لیے مسترد کر دی کہ عورت کا کچہری میں جانا ان کی خاندانی وجاہت کے خلاف تھا۔ امراؤ بیگم بھی غالب کی طرح تصنع کا شکار تھیں، ایک طرف انگریز حکام کے روبرو پنشن کے لیے گڑگڑانا اور دوسری طرف کچہری میں جا کر پنشن وصول کرنے میں سبکی محسوس کرنا ایک لغو سی بات ہے۔ امراؤ بیگم نے ۱۸۶۹ء میں چیف سکرٹری پنجاب کو پھر درخواست دی کہ ان کا متبنیٰ حسین علی خاں دائمی مریض ہے اور فاتر العقل ہے اس لیے اس کے گزارے کے لیے پنشن مقرر کی جائے۔ ظاہر ہے کہ انگریز حکام کو ایک فاتر العقل کی پرورش میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس لیے یہ درخواست بھی مسترد ہو گئی۔ امراؤ بیگم کی دونوں

درخواستیں رقت اور مبالغہ سے معمور ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد لوہارو خاندان کی جانب سے امراؤ بیگم کو ذاتی اخراجات کے لیے پچاس روپیہ مہینہ ملتے تھے جب کہ غالب کو انگریزوں کی جانب سے پینسٹھ روپے وصول ہوتے تھے۔ اور سو روپیہ ماہوار رام پور سے آتا تھا۔ اکیلی جان امراؤ بیگم کے لیے یہ ماہانہ رقم کافی تھی لیکن حسین علی کی بیخ ساتھ لگی ہوئی تھی۔ احوالِ غالب میں یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ لوہارو خاندان یا غالب کو ایک نابالغ، دائمی مریض اور فاتر العقل لڑکے کی شادی میں کیا عجلت تھی اور خصوصاً ان حالات میں جب غالب بے حد بیمار، ضعیف اور مالی مشکلات کا شکار تھے۔ غالب کی زندگی کے آخری تین چار سالوں میں حسین علی کے لیے دربار رامپور سے وظیفے کا اجرا اور اس کی شادی خاندانی عزت کا مسئلہ بن گیا تھا، اس ضمن میں غالب نے نواب رام پور کو ایسے خط لکھے کہ حیرت بھی ہوتی ہے اور غالب کی ذہنی حالت پر رحم بھی آتا ہے کہ ایک نابغہ روزگار تھوڑی سی رقم کے لیے اپنے آپ کو لولا، لنگڑا فقیر کہتا اور اپنے حق میں تراحم پیدا کرنے کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کرتا تھا، یہ رویہ بے حد افسوسناک تھا۔

پروفیسر حمید احمد خان کو غالب سے عقیدت تھی۔ یہی جذبہ انھیں کشاں کشاں ۱۹۳۸ء میں دہلی لے گیا جہاں انھوں نے غالب خاندان کی ایک ایسی ہستی سے ملاقات کی جو آٹھ دس برس غالب کے گھر میں رہیں۔ یہ غالب کے متبنی باقر حسین خان کی بیوی بگا بیگم تھیں۔ جب پروفیسر موصوف ان سے ملے تو ان کی عمر نوے برس تھی اور ان کے ہوش و حواس قائم تھے۔

اس ڈھیلے ڈھالے مکالمے میں بگا بیگم کی زبانی یہ معلوم ہوتا ہے کہ "وہ امچور کی ایک پھانک تھیں"۔ جو جا تے نماز پر بیٹھ کر اپنی موت کی دعائیں مانگتی تھی۔ غالب امراؤ بیگم کی پرہیز گاری کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ غالب خاندان کا ایک اور فرد راوی ہے کہ لوہارو خاندان کی عورتیں تیز مزاج مشہور تھیں اور اسی باعث بنیادی بیگم اور اس کے شوہر میں

علیحدگی ہوگئی تھی۔ غالب کا شمار دہلی کے خوبرو نوجوانوں میں ہوتا تھا اور ان کے مقابلے میں امراؤ بیگم ایک دبلی پتلی سی خاتون تھیں۔ اسی طرح غالب خاندان کی ایک خاتون راوی ہیں کہ بڑھاپے میں میاں بیوی میں لڑائی جھگڑا رہتا۔

یہ وہ اختلافات تھے جو ان دونوں کے درمیان حائل تھے۔ آخری عمر میں غالب بار بار اپنی موت کے لیے دعا مانگتے، دوسری طرف امراؤ بیگم موت کی منتظر رہتی تھی۔ دونوں میاں بیوی زندگی کا غم مشترک طور پر بانٹنے کی بجائے ایک دوسرے سے اور زندگی سے بیزار ہو کر موت چاہتے تھے۔۔۔ غالب ایک جگہ لکھتے ہیں:

"وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ؟ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد، ایک چونسٹھ برس کی عورت، ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی۔ تو بر ایں وبا ۱۸۶۱ء"۔ یوں لگتا ہے کہ بتدریج غالب اور امراؤ بیگم میں اختلافات کی خلیج اتنی وسیع ہو چکی تھی کہ دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لیے ناقابل برداشت ہو چکا تھا اور دونوں موت میں ایک دوسرے کی نجات دیکھتے تھے۔ غالب اور امراؤ بیگم کی شادی ایک "مس میچ" تھا۔ طبائع کے اختلاف، تنگدستی اور خاندانی رنجش نے غالب کی نجی زندگی میں ایک طرح کا مسلسل بحران پیدا کیا ہوا تھا۔ اولاد کی کمی نے غالب اور امراؤ بیگم میں کسی قدر مشترک کو بھی قائم نہیں رہنے دیا تھا، اس لیے غالب مستقبل کی فکر سے رہا ہو کر زندگی کو بسر کرتے تھے۔ غالب کے ذہنی انحطاط اور روحانی قلبیت میں ان کی تلخ ازدواجی زندگی ایک اہم محرک تھی۔ غالب اس حصار سے آزاد ہونے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے، اس لیے ایک ناراض اور بے عمل بوڑھے کی طرح اپنے آپ کو اپنی قسمت کو کوستے رہتے۔ یہ ایک ایسی شخصیت کا المیہ تھا جو قوتِ فیصلہ سے محروم تھی اور بغاوت کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔

غالب کی چچی غالب کے سسر الٰہی بخش اور والیٔ جھرکہ کی بہن تھیں۔ نصراللہ بیگ لاولد

تھے اور ان کی بیوی کا انتقال عین جوانی میں ہوا تھا۔ غالب اور ان کا خاندان نصراللہ بیگ کا واحد وارث تھا۔ نصراللہ بیگ کے ورثا کی پنشن کی ادائیگی لوہارو اور جھرکہ کے حصہ سرکار سے وضع ہو کر غالب خاندان کو ملنا تھی۔ یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ ان حالات کے پیشِ نظر غالب کا عقد الٰہی بخش کی بیٹی سے بچپن میں ہی طے پایا ہو۔ الٰہی بخش درویش صفت بزرگ تھے اور خود ان کا گزارہ احمد بخش کی جانب سے مقرر شدہ وظیفے پر ہوتا تھا۔ اس اعتبار سے غالب کا سسرال بھی محدود آمدنی کے طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق غالب کی شادی بچپن میں تیرہ برس کی عمر میں ۱۸۱۰ء میں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ غالب کا بجز پنشن کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا اور امراؤ بیگم اپنے ہمراہ کچھ ایسی سہولتیں بھی نہ لائی تھیں جن سے غالب کی زندگی میں کشادگی پیدا ہوتی۔ غالب کی ازدواجی زندگی کے بارے میں صرف اتنا پتہ ہے کہ تیس برس کی عمر تک ان کے یہاں سات بچے ہوئے لیکن ان میں سے کوئی بھی پندرہ ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ کثرتِ اولاد سے یہ مستخرج کیا جا سکتا ہے کہ جنسی اعتبار سے غالب بیحد فاعل تھے۔ تیرہ برس کی عمر میں شادی اور پھر سات بچوں کی پیدائش سے غالب ایسے آزاد منش، رنگین مزاج زوال پذیر عہد میں ملنے والے کے لیے امراؤ بیگم کے لیے کشش یا رغبت باقی نہیں رہی ہو گی۔ خود غالب Casual sexual تعلقات میں یقین رکھتے تھے: "ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ اور مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے کسی کے مرنے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے۔۔۔

۔۔۔غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو "چنا جان" نہ سہی "منا جان" سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامتِ جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ

زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے ۔۔ وہ خود اجیرن ہو جائے گی۔۔۔ وہی ایک حور۔۔" مرزا حاتم کو خط لکھتے ہوئے غالب نے جس ظاہری تمسخر سے کام لیا ہے اس کی تہہ میں غالب کی اپنی خواہش پنہاں ہے۔ بلکہ وہ آزاد جنسی عمل کی وکالت کرتے ہیں۔ غالب جس معاشرے میں رہتے تھے وہ اخلاقی بزدلی اور منافقت کا شکار تھا، تمام اخلاقی قدریں بھی دکھاوے کی تھیں۔ غالب بھی دوہری زندگی بسر کرتے تھے، ایک طرف ان کی ازدواجی زندگی میں ظاہر طور پر کوئی خلل نہیں تھا مگر ان کے ساتھ ڈومنی اور ترک بیگم کا قصہ بھی منسوب ہے، اوّل الذکر کا وہ اعتراف کھلے بندوں کرتے ہیں۔ جون ۱۸۶۰ء میں وہ مرزا حاتم علی کو لکھتے ہیں" بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پہ مرتے ہیں اسے بھی مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس کا یہ واقعہ ہے، باآں کہ یہ کوچہ چھٹ گیا، اس فن سے بیگانہ محض ہو گیا ہوں، لیکن اب بھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا "۔۔۔ یہ غالباً ۱۸۲۰ء/۱۸۲۲ء کا واقعہ ہوگا جب غالب تئیس چوبیس سال کے تھے۔ پھر جب غالب تیس برس کی عمر میں کلکتے کا سفر کرتے ہیں تو بنارس کی ہندو عورتیں اور بتانِ فرنگ ان کا دل موہ لیتی ہیں۔ ان اشاروں کے بعد غالب کی سرگزشت میں عورت کی خواہش کا کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔ غالب کی غزلوں میں سب سے مؤثر وہ ہیں جن میں انھوں نے کسی ایک جیتی جاگتی عورت سے اظہار عشق کیا ہے۔ ان کے یہاں عورت کا خیالی تصور کم ہے، عورت کا حسیاتی پہلو ان میں کیف و مستی کی کیفیت پیدا کرتا ہے اور اس سے دوری انھیں ملول کر دیتی ہے۔ غالب کے ان جذباتی اور نفسیاتی رجحانات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عورت کے بارے میں غالب کسی اندرونی حجاب اور امتناع کا شکار نہیں تھے۔ اس ذیل میں

غالب کی شخصیت کا ایک پُورا گوشہ اخفا میں ہے ۔ غالب جس معاشرے سے تعلق رکھتے تھے اس میں عورت اور مرد کو ملنے کی آزادی نہیں تھی۔ بنارس اور کلکتہ میں اُنھیں ہندوؤں اور انگریزوں کے اس ماحول کو دیکھنے کا موقعہ ملا جس میں عورت کو زیادہ آزادی میسر تھی جس نے یقیناً غالب کے ذہن میں فرسٹیشن پیدا کی ہو گئی، کیونکہ ان کے ماحول میں طوائف کے علاوہ کسی دوسری عورت سے کھُلے بندوں ملنے کا رواج نہیں تھا۔ اس صُورتِ حال میں امراؤ بیگم واحد عورت تھی جو غالب کی محبت اور نفرت کا ہدف تھی۔

غالب آزاد منش تھے اور ہر طرح کی پابندی سے گھبراتے تھے، وہ اپنی خانگی زندگی سے بے حد بور تھے "ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے۔ ایک تنہائی سے نفور ہے، ایک کو تنہائی منظور ہے ۔ تاہل میری مَوت ہے ۔ مَیں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پٹیالے جانے میں میری ایک سبکی اور ذلت تھی۔ اگرچہ مجھ کو دولت تنہائی میسر آجاتی۔ لیکن اس تنہائی چند روزہ اور تجرید مستعار کی کیا خوشی ؟ خدا نے لاولد رکھا تھا، شکر بجالاتا تھا۔ خُدا نے میرا شکر مقبول و منظور نہیں کیا ۔ یہ بلا بھی قبیلہ داری کی شکل کا نتیجہ ہے۔ یعنی جس لوہے کا طوق، اسی لوہے کی دو ہتھکڑیاں بھی پڑ گئیں۔ خیر اس کا کیا رونا ہے، یہ قید جاودانی ہے ۔ ۔ ۔ تجھ کو میری جان کی قسم اگر مَیں تنہا ہوتا تو اس وجہِ قلیل میں کیسا فارغ البال اور خوش حال رہتا" یہ خط ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا ہے جب غالب کی پنشن بند تھی اور وہ بے حد مضطرب تھے۔ غالب کی سوانح میں یہ خط بیحد اہم ہے ۔ اس خط کے حوالے سے اور چند دوسرے خطوط کی روشنی سے اس تصوّر کو تقویت ملتی ہے کہ غالب بظاہر لوہارو خاندان سے ملتے جُلتے تھے لیکن درونِ پردہ وہ اسے پسند نہیں کرتے تھے، اس ناپسندیدگی کی سب سے اہم وجہ غالب کی پنشن کا قضیہ تھا۔ ایک سے زیادہ مقامات پر غالب نے امراؤ بیگم اور لوہارو خاندان کے لیے شدید ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے ۔

غالب کی نجی زندگی کی بعض تفصیلات اس مفروضے کو مزید تقویت دیتی ہیں کہ غالب نے خانگی زندگی سے گریز کر کے اپنی الگ ایک دُنیا بنائی ہوئی تھی جس میں وہ محو رہتے ــــــ روایت ہے کہ غالب کے معمولات کچھ اس قسم کی تھیں کہ وہ صبح کے وقت شراب پی کر دہلی کے باغات میں گھومتے اور شعر گنگناتے۔ جب قلعہ معلیٰ میں ملازم ہوئے تو شام کے وقت قلعہ سے واپس آتے، شام کو شراب نوشی کرتے اور دوستوں سے گپ بازی کرتے۔ ان چھوٹی چھوٹی تفصیلات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب اپنے وقت کا بیشتر حصّہ علیحدگی میں بسر کرتے، امراؤ بیگم سے علیحدہ دوسرے مکان میں رہائش رکھنا بھی کافی معنی خیز ہے۔ غالب نے اپنے بڑھاپے اور بیماری کے بارے میں جو تفصیلات فراہم کی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کے آخری حصّے کا دارومدار ان کے ملازموں پر تھا۔ حیاتِ غالب میں سب سے چونکا دینے والا واقعہ غالب کی اسیری ہے، جیل میں ان کے کپڑوں میں غلاظت کی وجہ سے جوئیں پڑ گئیں تھیں، جب وہ جیل سے رہا ہوتے تو وہ اپنا کرتہ چاک کر کے غالباً برہنہ بدن باہر نکلے تھے۔ یہ واقعہ غالب خاندان کی غالب کے لیے سرد مہری اور غفلت کا بیّن ثبوت ہے۔ غالب کی وفات کی تفصیلات بھی اسی مفروضے کو تقویت دیتی ہیں۔ کہ غالب کے خانگی تعلقات ناہموار تھے۔ خود غالب نے اپنے مکاتیب میں اپنی ازدواجی زندگی کو موت سے تعبیر کیا ہے، اپنی یا امراؤ بیگم کی موت کی دُعائیں مانگی ہیں۔ انھوں نے اپنے فارسی کلام میں بھی "گھر میں لڑاکا بیوی" کا ذکر کیا ہے۔

غالب نہ صرف خود پرست تھے بلکہ ایک حد تک خود غرض قسم کے اِنسان تھے جو اپنے کھانے پینے اور لباس وغیرہ پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ کھانے کے دوران کوئی آجاتا تو اُسے کھانے کی دعوت دینے کی بجائے اپنی کم خوراکی کا ذکر بار بار کرتے، کوئی مہمان رہنے کے لیے آجاتا تو اسے نواب ضیاء الدین کے یہاں بھجوا دیتے اور اپنے مکان کی تنگی کا شکوہ کرتے، لیکن اپنی معمولات کی پابندی سرشوعت میں کرتے "مولانا غالب

علیہ الرحمۃ ان دنوں بہت خوش ہیں پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی آ گئی ہے۔ سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانے میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں، رات بھر شراب پیا کرتے ہیں۔ غالب کی آسائش اور مسرت کی خواہش ان کی ذات تک ہی محدود رہتی۔ وہ اپنی گرہستی میں تنگی ترشی کا ذکر کبھی کبھار ہی کرتے۔ یہ ان کی خود مرکزیت تھی، یہ ایک ایسا رجحان تھا جو انھیں اپنے آپ تک ہی محدود رکھتا۔

غالب اور ان کی خانگی زندگی میں مغائرت تھی، غالب اور امراؤ بیگم میں اختلافات کی بہت سی وجوہات تھیں، غالب ایک خوبصورت شخص تھے جو شراب نوشی، جوئے بازی اور غالباً ناچ گانے کے بھی شوقین تھے، انھیں اپنے حسن، اپنے شہر اور اپنی شہرت پر ناز تھا، ان کے برعکس امراؤ بیگم ایک عام سی ناخواندہ خاتون تھیں، امراؤ بیگم بھی ایک قلاش خاندان سے تعلّق رکھتی تھیں ان کی شادی نے غالب کی مالی مشکلات میں اضافہ کیا تھا، ایک جگہ بڑی حسرت سے وہ لکھتے ہیں کہ اگر وہ اکیلے ہوتے تو ان کی بڑے مزے میں گزرتی۔ وہ اپنی خانگی زندگی کو ایک بندش تصوّر کرتے ہوئے زندگی میں اپنی من مانی کرتے۔ دوسرے طرف لوہارو خاندان سے بگاڑ نے اُنھیں شعوری طور پر امراؤ بیگم سے دُور کر دیا تھا۔ اولاد کی کمی نے غالب کو مستقبل کے فکر سے آزاد کر دیا تھا تاہم ان کے یہاں ایک لاولد انسان کی خلش تھی۔ ذاتی تنہائی سے بچنے کے لیے اس نے باقر علی خان اور حسین علی کو متبنٰی بنایا تھا۔ غالب کی وفات کے بعد غالب کے لواحقین نے ان کی اشیاء، مسودات اور تحریروں سے جو سلوک کیا وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔

غالب اپنے حالات کی بدولت ایک ردِّ عمل کا شکار تھے، امراؤ بیگم سے ان کا تعلق بھی اس ردِّ عمل کی پیداوار تھا۔ غالب کی امراؤ بیگم کے لیے سرد مہری نے جواباً امراؤ بیگم میں بھی اسی رویّے کو جنم دیا تھا۔ چنانچہ غالب اور امراؤ بیگم ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے

بھی ایک دوسرے سے باہم اختلاف میں رہتے تھے۔ امراؤ بیگم ایک ایسے نابغہ کی بیوی تھی جو غالب کو ایک کم آمدنی کے شوہر سے زیادہ حیثیت نہیں دیتی تھی۔

غالب کی زندگی میں اضطراب اور انجام کار کلبیت کی ایک اہم وجہ ان کی مضطرب خانگی زندگی کی بدولت تھی۔ ان کی خانگی زندگی نے انھیں عمر بھر ایک مالی بحران کا شکار رکھا، اور غالب عمر بھر مالی سہولت کے منتظر رہے کہ انھیں سکون ملے تو وہ شعر و شاعری کا مکرر آغاز کریں۔ غالب منتظر رہے لیکن ان کی شخصیت میں ایسے تغیرات رونما ہو چکے تھے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "حواس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ فکر کروں؟ پیٹ پڑی روٹیاں تو سبھی گلاں ہوٹیاں"۔ وہ ہر لمحے اپنی اقتصادی ضروریات کو اپنے تخلیقی عمل پر ترجیح دیتے تھے۔ غالب زندگی کے آخری چند سال اپنے جسم و جاں، اپنے لکھنے پڑھنے اور اپنی خواہش سے متنفر ہو چکے تھے۔ یہ تنفر، اپنے شعر سے لاتعلقی اور بیزاری، خود اذیتی اور اپنی تضحیک ...... یہ سب کچھ اپنی بے بسی کے خلاف، اپنے ماحول کی جبریت اور اپنی خانگی زندگی کے خلاف ایک احتجاج تھا جس نے نہ صرف غالب کو نقصان پہنچایا بلکہ ان کے تخلیقی عمل میں سدِّ راہ ثابت ہوا۔

غالب اور انگریز

غالب کی زندگی طرح طرح کے حادثات سے معمور تھی۔ کچھ حادثات غالب کے انتخابات کا نتیجہ تھے اور کچھ ان حالات کی پیداوار تھے جن میں غالب نے اپنے آپ کو ایک تنکے کی طرح بہنے دیا تھا۔ غالب کی عملی زندگی بظاہر تساہل کا شکار تھی لیکن داخلی طور پر وہ ایک بے چین روح تھے۔ ان کی خواہشوں اور عمل میں ایک واضح بُعد تھا۔ غالب ہر فعل اور ہر بات کو اس کے فوری نتائج میں دیکھنا چاہتے تھے، وہ ایک زیرک دُنیادار تھے لیکن پور پور شاعر بھی تھے اس لیے عملی زندگی میں شاعرانہ طبیعت کی بدولت اپنے اصل ہدف سے بہت جلد بھٹک جاتے، اور بعد میں اپنی شومئی قسمت کا گلہ بھی کرتے۔ آگرہ کی ایک شکستہ حویلی میں غالب کی پیدائش خود غالب کے لیے اور اُردو ادب کے لیے ایک حادثہ تھی۔ غالب اگر صابر اور قانع ہوتے تو وہ ہر طرح کی الجھنوں سے آزاد رہتے، مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ غالب کا خاندان، دوسرے ممتاز خاندانوں کی طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کا پنشن دار تھا جس کی وفاداری کسی نظامِ حکومت یا کسی سیاسی تصوّر سے وابستہ نہیں تھی۔ غالب اس عہد سے خوشحالی اور عافیت کے طلب گار تھے جو خود بے دست و پا تھا۔ تاریخی اعتبار سے ۱۸۵۷ء کا واقعہ اتنی اہمیت کا مالک ہے کہ ایسٹ انڈیا کی جگہ ملکہ وکٹوریہ نے لے لی تھی باقی نظم ونسق وہی تھا۔ ہندوستان کی تسخیر کا عمل کم و بیش ایک صدی قبل شروع ہو چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی انگریز لال قلعہ

کے سوا دہلی اور اس کے گرد و نواح پر قابض ہو چکے تھے۔ دہلی دار الخلافہ تھا اور ۱۸۵۷ء کے واقعات کا سب سے زیادہ اثر دہلی پر مرتب ہوا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد میں ہر طرف دہشت اور سراسیمگی کی فضا طاری تھی۔ سب پر واضح ہو چکا تھا کہ انگریز کی اطاعت کے لیے بھی بدلی ہوئی صورتِ حال میں ایک نئے دستور العمل کی ضرورت تھی۔ سرسیّد احمد کا مفاہمت کا رویّہ اس زمانے کی پیداوار تھا جب انگریزوں کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا اور وہ اپنا انتظام و انصرام درست کرنے میں مصروف تھے۔ غالب کی زندگی کے اہم واقعات ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز محکوموں کے ساتھ کسی قسم کی بحث و تمحیث کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ صرف اطاعت چاہتے تھے۔ سخت گیری ان کا سرکاری رویّہ تھا۔ غالب اپنے عہد کے نامور شاعر تھے انھیں بھی انگریزوں سے اپنا معاملہ طے کرنا تھا وہ سرکاری سطح پر اپنی ادبی حیثیت منوانا چاہتے تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی پنشن کا مقدمہ طے کروانے کی تگ و دو میں مصروف تھے۔ چنانچہ غالب عمر بھر اسی جدّوجہد میں لگے رہے کہ انگریز حکام ان کی ادبی حیثیت کو تسلیم کر کے انھیں مراعات دیں۔ بے شک غالب کے انگریزوں سے تعلقات خوشامدانہ تھے، یہ ہرگز مساوی بنیادوں پر نہیں تھے۔ غالب اپنے خیال میں اپنے عہد کے سب سے نامور شاعر تھے اس لیے وہ تعظیم کے حقدار تھے لیکن غالب ایک سائل تھے۔ انھوں نے یہ تأثر دیا ہوا تھا کہ ان کے انگریز حکام سے تعلقات بڑے خوشگوار تھے۔ حقیقت یہ تھی کے انگریز غالب کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ غالب بڑی محنت سے ان کے قصیدے لکھتے لیکن وہ انھیں گول کر دیتے اور غالب انتقاماً یا ضرورتاً وہ قصائد کسی اور کے نام معنون کر دیتے۔

یُوں تو کہنے کو غالب کے انگریز حکام سے ٹھیک ٹھاک تعلقات تھے۔ میجر جیکب ان کا دوست بھی تھا اور شاگرد بھی۔ ۱۸۵۷ء میں وہ انقلابیوں کے ہاتھوں

مارا گیا اور غالب نے اس کی موت پر بڑے غم و غصہ کا اظہار کیا۔ ولیم فریزر بھی ان کا دوست تھا۔ غالب انگریزوں کے نمک خوار تھے اس لیے انگریز ڈپٹی کمشنروں اور کمشنروں کے تبادلوں میں گہری دلچسپی لیتے۔ جب ان کی صحت اچھی تھی تو وہ دن میں ایک آدھ بار کچہریوں کا چکر بھی لگاتے اور ایک پنشن دار ہونے کے ناطے اپنے آپ کو انتظامیہ کا غیر رسمی رکن تصور کرتے تھے۔ حقیقت میں غالب کا تعلق کچہریوں کے منشیوں، ریڈروں اور اہلکاروں سے زیادہ تھا۔ وہ پنشن کی وصولی کے وقت انہیں تھوڑی بہت رشوت بھی دیتے تھے۔ غالب کا انگریزوں سے تعلق دو پشتوں سے تھا ان کے چچا اور والد بھاڑے کے سپاہی تھے۔ انیسویں صدی میں ایسے سپاہیوں کی کمی نہیں تھی جو کسی اجتماعی نصب العین کے فقدان کے باعث صرف روپے پیسے کے لیے فوجوں کے رسالے تیار کرتے تھے۔ غالب کے انگریزوں سے تعلقات پر بعض نقادوں نے بڑی لے دے کی ہے کہ غالب ایک بے ضمیر قسم کے چاپلوس تھے جو چھوٹے چھوٹے مفادات کے لیے سر خم کر دیتے تھے۔ یہ اعتراضات اپنے طور پر درست ہیں، لیکن غالب کے ذہنی فریم ورک کو غالب کی ذہنی حالت اور ان کے عہد کی سیاسی صورتِ حال سے منسلک کر کے دیکھنا چاہیے۔ غالب کا تمام عہد اپنے کمزور حکمرانوں کی بدولت سزا کاٹ رہا تھا، ہر کوئی خوف اور بے یقینی کا شکار تھا، انگریز حکمران بہتر ٹیکنالوجی اور بہتر سیاسی حکمتِ عملی کے حامل تھے۔ جس شہر کا تاجدار خود انگریزوں کی مالی اعانت کا محتاج تھا اور جس کے دربار کا شاعر بھی انگریزوں کا پنشن دار تھا، وہ کیونکر ایک انقلابی دانشور کا منصب ادا کر سکتا تھا؟ غالب اور اس کا عہد انگریزوں سے بے حد خائف تھا مغلوں کی نسبت انگریزوں کا سٹیٹ کرافٹ اور دوسرے معاملات میں ان کی سٹریٹیجی بالکل مختلف تھی۔ وہ ہر شعبۂ حیات میں اپنے حمایتی اور وفادار چاہتے تھے۔ ہر کوئی یہ جانتا تھا کہ انگریز حکمرانوں کے ساتھ مفاہمت کے ذریعے ہی زندگی ممکن تھی، یہی رویہ زیادہ بہتر شکل

ہیں سرسید کے تصورات کی بنیاد بنا تھا۔ غالب کے بارے میں یہ اعتراض حق بجانب ہے کہ وہ انگریزوں کی چاپلوسی میں قدرے پیش پیش تھے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے ذوق اور مومن زندہ تھے، ادھر لکھنؤ میں میرانیس، آتش اور ناسخ بھی موجود تھے ان سے ذرا پہلے انگریزوں کے زمانے ہی میں میر تقی میر بھی موجود تھے لیکن ان مشاہیر میں سے کوئی بھی غالب کی طرح بے چین نہیں تھا کہ وہ نئی حکومت سے رابطہ قائم کرے۔ بے شک غالب کے خاندان کی تاریخ مختلف تھی اور وہ جن حالات کے اسیر تھے وہ دوسرے معاصر شعراء کی نسبت مختلف تھے۔ غالب انگریز حکمرانوں سے بوجوہ قرب چاہتے تھے۔ وہ اپنے معاصر ادبی سین پر حاوی ہونے کے آرزومند تھے۔ اس کا واحد طریقہ غالب کے خیال میں حکمران طبقے کی خوشنودی اور قرب حاصل کرنا تھا۔ غالب اس کے سوا اور بہت کچھ بھی چاہتے تھے۔ انھوں نے انگریزوں سے قرب حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی تھی، یہ اور بات تھی کہ ان کی منصوبہ بندی ناقص تھی اور ان کا تاریخ کا مطالعہ بھی شاعرانہ نوعیت کا تھا۔ اس لیے غالب انگریزوں کے حضور سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔ ان کی موروثی پنشن ان کے اجداد کی انگریز دوستی کا نتیجہ تھی اور غالب اس گڈول کو قائم رکھنا چاہتے تھے کہ اتھارٹی سے منسلک ہو کر ہی کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا تیس سال کی عمر میں غالب نے قیام کلکتہ کے دوران اپنی انگریز دوستی کے منصوبے پر عملدرآمد شروع کیا تھا۔ انھوں نے لیفٹیننٹ گورنر کا قصیدہ لکھا، پھر ملکہ وکٹوریہ کا درباری شاعر بننے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن انگریز حکام جواباً خاموش رہے۔ غالب اس سرد مہری سے برگشتہ نہ ہوتے، یہ ان کی خود فریبی تھی یا خوش فہمی کہ انگریز ان کے ہنر کے قدردان تھے اور ان کے خاندان کی خدمات کے معترف تھے۔ بہرکیف غالب ہمت ہارنے والے نہیں تھے۔ دوسری طرف وہ ذوق کے ہوتے ہوئے بہادر شاہ ظفر کے درباری شاعر نہیں بن سکتے تھے، چنانچہ غالب نے ایک ہی ملک کے دوسرے حکمران کے ساتھ

بھی اپنا تعلق استوار کرنے کی کوشش کی کہ ان کا پبلک امیج اہم ہو جاتے۔ غالب نے اس بارے میں بڑی تندھی سے کام لیا اور کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس ضمن میں نواب شمس الدین کے خلاف غالب کی مخبری کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ وہ زندگی میں اعلیٰ اخلاقی قدروں یا ضمیر کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ان پر ایک کامیاب اور مرفعہ حال زندگی بسر کرنے کا بھوت سوار تھا۔

غالب کی انگریز دوستی کے عمل میں صرف اتنی پیش رفت ہوئی کہ رفتہ رفتہ غالب کو خلعتیں ملنے لگیں اور دربار میں بھی انھیں نشست بھی ملنے لگی۔ غالب اسے اپنی کامیابی تصور کرتے تھے کہ حکام انھیں خان صاحب بسیار مہربان دوست کے لقب سے خطاب کرتے تھے اور اس پر وہ بہت مسرور تھے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ غالب کلکتہ میں فری میسن کے ممبر بن گئے تھے اور لوگوں کے اصرار پر اس پُر اسرار تنظیم کے بارے میں کچھ نہیں بتاتے تھے۔ غالب اس تنظیم میں غالباً انگریزوں کی خوشنودی یا مالی امداد حاصل کرنے کے لیے شامل ہوئے تھے۔

یہ بات بدیہی ہے کہ غالب کو بہادر شاہ سے نہ تو کوئی عقیدت تھی اور نہ ہی کسی قسم کا جذباتی لگاؤ تھا وہ یہ جانتے تھے کہ پرانا سوشل آرڈر انہیں ان کی متصورہ زندگی کا قرینہ فراہم نہیں کر سکتا۔ نئے آرڈر کے بارے میں غالب خوش فہم تھے کہ نئے حکمرانوں کو ان کی ضرورت تھی اور وہ بطور شاعر اپنی ساکھ بحال کر سکیں گے۔ غالب اپنی ادبی حیثیت کے بارے میں عجیب وغریب تذبذب کا شکار تھے۔ کبھی وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور کبھی وہ نواب شاعروں کے روبرو گڑگڑانے لگتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ ہر وقت حکام کی سرپرستی کے متمنی رہتے۔ غالب نئے سوشل آڈر میں اپنے لیے انصاف چاہتے تھے لیکن وہ یہ حقیقت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ غیر ملکی حکمرانوں کی انتظامی سکیم میں کسی درباری شاعر کی گنجائش نہیں تھی۔ غالب ان کے لیے غیر ضروری تھے۔

انھیں اپنی ستائش کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ ملکی سیاست کو مغلوب کر چکے تھے، لیکن غالب ہمت ہارنے والے نہیں تھے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے غالب اپنی شہرت کے عروج پر تھے معاصر اخبار ان کے واقعات کا نوٹس بھی لیتے تھے، اس شہرت کے باوجود غالب کو انگریزوں سے کوئی مراعات حاصل نہیں تھی۔ وہ پریوی کونسل میں اپنی پنشن کا مقدمہ ہار گئے تھے۔ ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء میں دو مرتبہ انھیں جوا کھیلنے اور جوا کی بیٹھک چلانے پر سزا ہوئی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دو ڈھائی سال ان کی پنشن بھی بند رہی۔ ان واقعات سے کم از کم یہ ظاہر ہوتا ہے کے غالب حق یافتہ نہیں تھے اور انگریز ان سے ترجیحی سلوک نہیں کرتے تھے۔

روپے پیسے کے معاملے میں غالب اعلیٰ فراست کے مالک نہیں تھے وہ روپیہ پیسہ حاصل کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے خواہ بعد میں انھیں ندامت ہی کیوں نہ اٹھانی پڑے وہ اتنے فاقہ مست نہیں تھے لیکن وہ بیحد طامع تھے۔ ان کی یہی طمع ان کی مشکلات کا باعث بنی۔ غالب کی یہ تمنا تھی کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے لال قلعے کی دہلیز تک جا پہنچیں ۔ ان کی اُمید بر آئی اور وہ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک لال قلعے سے متعلق رہے جہاں انھیں سو روپیہ ماہوار ملتا تھا۔ انھوں نے یہ پل بھر کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ ان کا پاؤں دو کشتیوں میں تھا۔ چنانچہ وہی ہوا اور غالب کی پنشن ۱۸۵۷ء کے دوران ہی بند ہو گئی۔ غالب کو اپنی دو عملی کا احساس دہلی میں ۱۸۵۷ء کی جنگ کے دوران ہی ہو چکا تھا، اس لیے فسادات کے دوران انھوں نے اپنے گھر کا دروازہ بند کیا اور دہلی کے اجڑنے کی داستان "دستنبو" کے عنوان کے تحت لکھنے بیٹھ گئے۔ غالب کی یہ تصنیف عجیب و غریب قسم کی ہے اس کی ابتدا زندگی اور زمانے کے عروج و زوال کے بارے میں غالب کے نیم فلسفیانہ تصورات سے ہوتی ہے پھر وہ انگریزوں کی فتح دہلی کو ایک مبارک اور نیک بختی کا

شگون قرار دیتے ہوئے دہلی کی تباہی کا منظر بیان کرتے ہیں، اور کچھ باتیں اپنے بارے میں بھی بتاتے ہیں۔ غالب نے یہ کتابچہ قدیم اور متروک فارسی میں تحریر کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ اس میں ایک لفظ بھی عربی کا استعمال نہیں کیا۔ غالب نے متروک فارسی اس لیے لکھی کہ ان کے معاصرین اس کتاب کو سمجھ نہ سکیں یا کم سے کم لوگ اس کا مطالعہ کر سکیں۔ اس کا متن یقیناً قابلِ اعتراض تھا اور باعثِ شرم بھی کہ اس میں احساسِ شکست اور بے بسی نمایاں ہیں۔ غالب بظاہر انگریزوں کی تعریف کرتے ہیں لیکن چوری چھپے حکایت خوانچکاں بھی بیان کرتے ہیں، دوسروں کی بربادی میں اپنی اندرونی بربادی کا حال بھی کہتے ہیں۔ "پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر پر ہوا، پہلا باغیوں کا اس میں اہلِ شہر کا اعتبار لٹا، دوسرا لشکر خاکیوں کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکیں و زمین و آثار بستی سراسر لٹ گئے تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے چوتھا لشکر ہیضے کا، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب و طاقت عموماً لُٹ گئی۔ مرے آدمی کم لیکن جس کو تپ آئی اس نے پھر اعضا میں طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کُوچ نہیں کیا۔"

پھر ۱۸۶۰ء میں دہلی کی بربادی کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں: "حضرت، انہدام مساکن و مساجد کا کیا حال گزارش کروں؟ بانیِ شہر کو وہ اہتمام مکانات کے بنانے میں نہ ہوگا جواب والیانِ ملک کو ڈھانے میں ہے . . . . غلے کی گرانی، آفتِ آسمانی، امراضِ دموی، بلائے جانی"۔ یہ اقتباس بھی غالب کے مکاتیب سے ہے۔ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۶۰ء میں غالب کی ذہنی کیفیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ مکاتیب بھی غالب کی زندگی میں شائع ہوئے۔ اُردو کا کلاسیکل شاعر اپنے ملک کی تسخیر پر فاتحوں کو مبارکباد دے رہا تھا اور ان انقلابیوں کو لعن طعن کر رہا تھا جنھوں نے دہلی میں انگریزوں کو تہ تیغ کیا تھا۔

۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۸ء کے دوران غالب دستنبو کی اشاعت کے لیے بڑی تندھی سے کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے انگریز حکام کو خوش کرنے کے لیے اس کتاب کی خصوصی جلد بندی کرائی اور اس کے ہمراہ ایک قصیدہ بھی حکام کو مرسل کیا۔ لیکن ان مساعی کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا اور غالب کی پنشن بدستور بند رہی۔ اس دوران انھوں نے انگریز حکام سے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے کئی مواقع تلاش کیے لیکن انگریز غالب سے بدظن ہو چکے تھے۔ غالب پر دو طرح کے شبہات تھے، اول یہ کہ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کا سکہ لکھا تھا، اس بارے میں انھوں نے بار بار یہ واضح کیا کہ انھوں نے بادشاہ کا سکہ نہیں لکھا تھا دوسرے یہ کہ وہ بادشاہ کے وفادار تھے اور اس کے درباری شاعر تھے۔ انگریزوں کی ناراضگی اور پنشن کے مسدود ہونے سے غالب ابتلا میں تھے ۱۸۶۳ میں وہ اس واقعہ کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں "ان کے خیمے میں اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرٹر بہادر کے پاس بھیجا، جواب آیا" تم غدر کے دنوں میں بادشاہ باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں۔۔ مَیں گدائے مبرم اس حکم سے ممنوع نہ ہُوا۔۔۔۔ جب لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہنچے، مَیں نے قصیدہ حسبِ معمول قدیم بھیج دیا، مع اس حکم کے واپس آیا کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔ مَیں مایوس مطلق ہو کر بیٹھ رہا اور حکامِ شہر سے ملنا ترک کیا"۔

اس واقعہ سے پہلے غالب گورنر جنرل کو یہ یقین بھی دلا چکے تھے "باغیوں سے میرا اخلاص مظنۂ محض ہے اُمیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہوں تاکہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو"۔ شروع سے لے کر آخر تک غالب کی کوشش تھی کہ وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کریں کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء میں کسی قسم کی شرکت نہیں کی۔ بڑی تگ و دو کے بعد غالب کی پنشن واگزار ہوئی اور انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ دستنبو انفرادی خوف اور اجتماعی دہشت کا نتیجہ تھی۔ اس میں کچھ ملے جلے جذبات تھے۔ دستنبو لکھتے

وقت اپنے آپ اور انگریزوں کو دھوکہ دے رہے تھے۔ دستنبو کے بین السطور ایک اور کتاب جلتی ہوئی نظر آتی ہے، غالب فتح دہلی کے ساتھ اس کی غارتگری بھی دکھاتے ہیں، اپنے ان دوستوں کی نوحہ گری بھی کرتے ہیں جو اس واقعہ میں جاں بحق ہوتے۔

جب غالب کی پنشن واگزار ہوگئی تو ان کا ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بارے میں نقطہ نظر بھی بدل گیا تھا۔ انگریزوں اور انگریزوں کی فتح کی تعریف ایک کیمفلاج تھا جس کے اندر ایک حساس شاعر کا ضمیر مجرم تڑپ رہا تھا، وہ ایسی باتیں کہنے پر مجبور تھا جنھیں وہ صدق دِل سے نہیں مانتے تھے۔ یہ دوزخی یا دوعملی غالب کی ایجاد نہ تھی، وہ سارا عہد اس کا شکار تھا۔ غالب نے اپنے مکاتیب میں ۱۸۵۷ء اور دہلی کے اجڑنے پر شدید ردِ عمل کا اظہار کیا تھا۔ یہ ان کے لیے ایک شخصی حادثہ بھی تھا کہ ان کے دوستوں کی محفل اجڑ گئی، شعروشاعری کی محافل برباد ہوگئیں اور غالب جس نظام میں اپنی حیثیت منوانا چاہتے تھے وہ دم توڑ چکا تھا۔ غالب نے مختلف طریقوں سے اس بدلی ہوئی صورتحال سے مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اکھڑے اکھڑے سے رہے۔ ۱۸۵۷ کے واقعہ نے غالب کے تخلیقی عمل کو بُری طرح متاثر کیا، ان میں لکھنے کی آرزو بھی مٹ گئی۔ وہ اپنے آپ کو دہلی کا شاعر کہتے تھے لیکن اس شہر کا یہ حال ہوچکا تھا۔ "نظام الدین ممنوں کہاں؟ ذوق کہاں؟ مومن خاں کہاں؟ ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالب سو بے خود و مدہوش، نہ سخنوری رہی نہ سخندانی، کس برتے پہ تتا پانی؟ ہائے دلی۔۔ ہائے دِلی، بھاڑ میں جائے دلّی۔"

غالب ۱۸۵۷ء کے بعد بارہ برس اور جئے، وہ انگریز حکام کی تعریف کے ساتھ ساتھ اپنے شہر دہلی اور اپنی کمزور ذات کا مرثیہ بھی پڑھتے رہے۔ غالب کچھ تو اپنے ہاتھوں مجبور تھے اور کچھ اس عہد کے سامنے بے بس تھے جس سے وہ ماوراء ہونے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔ ستم یہ کہ غالب نے اپنی معیشت کے لیے اپنے فن کی قربانی دی، انگریزوں

کے قصائد لکھے، ان کا احترام کیا لیکن اس کے عوض انھوں نے غالب کی زندگی میں اور موت کے بعد بھی ان کی عظمت کا اعتراف نہ کیا بلکہ پروفیسر علمدار حسین نے ان کی کتاب قاطع برھان کو غیر معیاری قرار دے کر نصاب میں شامل نہ ہونے دیا۔ ان کی بیوہ امراؤ بیگم بھی ان کی وفات کے بعد حکام کی سرد مہری کا شکار رہی۔ غالب کا انگریزوں سے تعلق حاکم و محکوم کا تھا۔ غالب سائل تھے اور حکام انھیں مراعتیں دینے کے لیے تیار نہیں تھے اور ان کا رویہ خنک بلکہ توہین آمیز تھا۔ یہ غالب کے لیے تکلیف دہ تھا۔ غالب اور ان کا پورا عہد اس توہین میں رہنے پر مجبور تھا، یہ ایک سزا تھی جو تاریخ اس عہد کو دے رہی تھی۔

غالب، ایک شاعر ایک اداکار

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالب تو پھر
کیوں نہ دِلّی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے

غالب کی کہانی دہلی کے اجڑنے کی کہانی ہے، غالب کا اخلاقی ضعف ایک عہد کی ناتوانی ہے . . . دہلی تو کئی بار اجڑی لیکن آخری مرتبہ ایسی تاراج ہُوئی کہ پھر آباد نہ ہو سکی۔ راج دہانی کا اجاڑ ایک تہذیب کی ویرانی تھی جس کی جذباتی اور نفسیاتی حالت کو حیاتِ غالب کے ذریعے بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کی زندگی کی خواہشوں اور مصیبتوں میں ایک عہد کی سائیکی پُوری طرح منعکس ہوتی ہے۔ کاش غالب کی زندگی کے حالات پوری طرح سے قلم بند کیے جاتے تو ان کی زندگی کو ان کے فن سے مربوط کیا جا سکتا تاکہ ان کی داستان ادھوری نہ رہتی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ غالب کی اپنے عہد میں شہرت کے بعض اسباب سطحی تھے۔ غالب اپنی فارسی شاعری کی وجہ سے مشہور تھے، ان کی نوابی خود پسندی، مے نوشی اور حکام سے دوستی ان کی شہرت کے بعض اسباب تھے کہنے کو تو غالب دنیوی معاملات میں بڑے زیرک تھے لیکن وہ بنیادی طور پر ایک شاعر تھے جو زندگی میں بھی مبالغہ آمیزی سے کام لیتے تھے، وہ جو کچھ نہیں تھے وہ بننا چاہتے تھے اور جو کچھ تھے اس سے گریز کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی موقعیت سے فرار چاہتے تھے کیونکہ وہ اپنے آپ سے رو برو ہونے کا حوصلہ

نہیں رکھتے تھے، اس طرح ان کو اپنے آپ کے پاش پاش ہونے کا خوف تھا۔ غالب اگر صرف دہلی کے ایک کھوکھلے نواب ہوتے تو پھر بات زیادہ نہ بگڑتی یا پھر وہ قانع قسم کے شاعر ہوتے تو پھر بھی ان کی گزر اوقات ہو جاتی۔ غالب کے مصائب کی ایک وجہ ان کی اکبر آباد کی شکستہ حویلی میں تھی، ان کے ایک دور رشتہ دار معمولی قسم کے جاگیر دار تھے، ان کے درمیان رہتے ہوئے غالب بھی ایک نواب کا روپ دھارنے پر مجبور تھے۔ یہ وہ اس عہد کی نوابی یعنی خود فریبی کی اصل حقیقت سے واقف تھے؛ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بادشاہ محصور اور قلاش تھا، غالب کا نوابی کا روپ دہارنے کا فیصلہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے نصراللہ بیگ کا نام ضرورت سے زیادہ استعمال کیا۔ . . . وہ اپنی عرائض کے نیچے اسداللہ خاں غالب برادرزادہ نصراللہ بیگ جاگیردار تحریر کرتے۔ اس کی ایک غایت انگریز حکام پر اپنی خاندانی مرتبے کی عظمت ثابت کر کے زیادہ سے زیادہ پنشن کا حق ثابت کرنا تھا اور دوسری طرف وہ نواب شاعر کا روپ دھار کر اپنی شاعری اور اپنے سماجی رتبہ کو متمیز کرنا چاہتے تھے۔ غالب ہر معاملے میں اپنی انفرادیت قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ انگریز حکام سے دوستی، لال قلعے سے تعلق، کھلے بندوں مے نوشی اور اس کا اعتراف، ولایتی کپڑے کی پوشاک، فری میسن کی ممبرشپ وغیرہ وہ چند واقعات تھے جو غالبؔ کو اس دَور کی عمومی اسلوب زندگی سے متمیز کرتے ہیں۔ غالب اپنی زندگی اور اپنی شاعری میں شکوہ چاہتے تھے، وہ جو کچھ نہیں تھے وہ بننے کے متمنی تھے اور جو کچھ تھے اس سے گریز کر کے اپنے آپ کو اور اپنے عوامل کو اپنی متصورہ زندگی کے مطابق ڈھالنا چاہتے تھے۔ یہ ایک رول تھا جو غالب نے اپنے لیے تجویز کیا تھا وہ بیحد مشکل تھا، وہ جس سٹیج پر اور جن ناظرین کے درمیان اپنا رول ادا کرنا چاہتے تھے وہ ان کے اندازے کے مطابق نہیں تھے۔ غالب کی متصورہ زندگی اور ان کی ذات کے درمیان ایک سفاک معروضیت حائل تھی۔ یہ وہ معروضیت

تھی جس نے مختلف واقعات کا روپ دھار کر غالب کو ایک طویل عرصے تک پریشان رکھا اور غالب ان واقعات کے خلاف نبرد آزما ہونے کی بجائے اپنے آپ کو حالات کے سپرد کرتے گئے۔ غالب کے حالات کیا تھے؟ یہ ایک گنجلک بحث ہے۔ کچھ حالات متوارث ہوتے ہیں، کچھ معروضیت کی طرف سے نافذ ہوتے ہیں اور کچھ انفرادی فیصلوں کا نتیجہ ہوتے ہیں، غالب کے خاندانی اور نجی حالات نے انھیں بعض ایسے فیصلوں پر مجبور کیا تھا جن کے مضمرات سے وہ آشنا نہیں تھے، دوسری طرف انھوں نے بعض ایسے اقدام لیے جن پر وہ کاربند رہنے پر مجبور تھے۔ ان کی مجبوری ہیں ان کی نفسیاتی افتادِ طبع اور ان کے معاشرے کا دباؤ برابر کے شریک تھے۔ غالب کمزور قوتِ ارادی کے حامل تھے، وہ خاندانی شرافت کا دھیان بھی رکھتے تھے لیکن اس کے ساتھ وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے متمنی تھے۔ غالب کی شخصیت میں مغلوبیت کا رجحان بڑا قوی تھا، وہ اپنی خواہشات کے غلام تھے۔ انھیں اپنے آپ پر قابو نہیں تھا چھوٹی سے چھوٹی خواہش پوری نہ ہونے پر ملول ہو جاتے۔ ذرا سی تنگی ترشی ہوتی تو اسے بہت بڑی مصیبت بنا کر خود ترحمی کی تصویر بن جاتے۔ غالب بنیادی طور پر صلح پسند شخص تھے جو مقابلے یا مخالفت کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے، کیونکہ جو کچھ ان کے پاس تھا اسے وہ کھونا نہیں چاہتے تھے اور جو کچھ ان کے پاس نہیں تھا اسے وہ خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ کلکتہ میں قتیل کے حواریوں سے ٹھنی تو صلح پر آمادہ ہو گئے، ذوق سے اختلاف ہوا تو معافی مانگ لی، ازالہ حیثیت عرفی میں بات نہ بنی تو مصالحت کی کوشش کرنے لگے۔ غالب کا زمانہ مصالحت اور مفاہمت کا دور تھا، زندگی میں اجتماعی نصب العین کی کمی اور اخلاقی اقدار کی غیر حاضری کی بدولت ہر کوئی آویزش سے گریز کرتا تھا کہ ذاتی رنجش سیاسی بدگمانی اور الزام تراشی میں تبدیل نہ ہو جائے۔ اس اجتماعی نفسیاتی حالت کی وجہ غیر ملکی حکمرانوں کا خوف تھا اور اس کی سب سے مؤثر مثال ۵۷ء ۱۸ کے دوران

غالب کی حالت تھی جب انھوں نے خوف اور الزام سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو گھر میں مقفل کر لیا تھا اور ۱۸۵۷ء کے بعد ایک مدت تک اپنے مکاتیب کے ذریعے یہ ثابت کرتے رہے کہ وہ فسادات میں کسی طور ملوث نہیں تھے۔

غالب کی شخصیت کی تشکیل میں ان کی نجی زندگی کے بعض واقعات اور ان کے ماحول نے برابر کی شرکت کی تھی۔ غالب کی زندگی ایک کاہل اور سست رو شخص کی زندگی تھی جس میں واقعات کی کمی تھی لیکن انھوں نے اپنے بارے ایک دو ایسے فیصلے کیے کہ ان کی تمام زندگی ایک ہی واقعہ اور ایک ہی صورتِ حال کا اکتا دینے والا تسلسل بن گئی تھی۔ حالی لکھتے ہیں کہ غالب کی زندگی میں شاعری کے سوا اور کوئی مہتم بالشان واقعہ نہیں تھا، یہ بیان بظاہر کتنی صداقت کا حامل ہے لیکن حالی کی نگاہ اس حقیقت پر نہیں پڑی کہ غالب صرف ایک لٹے کھسے نواب کی زندگی ہی بسر نہیں کر رہے تھے وہ ایک زوال پذیر تمدن اور اعلیٰ انسانی اقدار سے عاری عہد کو عملی طور پر بسر کر رہے تھے۔ اس طرح غالب کے ذریعے ان کے عہد کی شناخت کی جا سکتی ہے۔

غالب نے جن حالات میں جنم لیا وہ افسوس ناک تھے، انھوں نے جن حالات میں زندگی بسر کی وہ بھی افسوسناک تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ امراؤ بیگم سے شادی اور لوہارو خاندان سے قرابت داری تھی۔ یہ غالب کے لیے تمام عمر پریشانی کا باعث رہا۔ غالب کا لوہارو خاندان سے نفرت اور پسندیدگی کا دوہرا رشتہ تھا لیکن مجموعی اعتبار سے غالب اس خاندان سے بے حد مرعوب تھے، ان کی چچی اور بیوی اسی خاندان سے آئی تھیں، اور ان کی موروثی پنشن بھی جاگیر لوہارو سے وصول ہوتی تھی۔ ان کے اپنے سالے علی بخش رنجور سے اچھے تعلقات تھے اور غالب ان تعلقات کو بگاڑنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ یہ خاندان انگریزوں کے مفادات کا رکھوالا تھا اور ایک حد تک مؤثر بھی تھا لیکن قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔ غالب کے سب قیافے اور مفروضے مات کھا گئے

اور لوہارو خاندان ان کے دل وجان کی تنگی کا باعث بنا۔ امراؤ بیگم سے غالب کی شادی سے ان کی مصیبتوں کا آغاز ہُوا۔ خاندانی پنشن ان کی ازدواجی زندگی کے مصارف کے لیے ناکافی تھی، شادی کے چند سال بعد وہ بطور خانہ داماد اکبر آباد میں رہے اور پھر اٹھارہ انیس برس کی عمر میں دہلی چلے گئے جہاں اُنھوں نے کرائے کا مکان لیا۔ نہ غالب کو اپنے ننھیال سے کچھ ملا اور نہ ہی امراؤ بیگم لوہارو جاگیر سے جہیز میں کچھ اپنے ساتھ لائیں، چنانچہ شخصی ضرورتوں کے دباؤ نے اوائل عمر میں ہی انھیں قرض کے ذریعے زندگی بسر کرنے کے اسلوب پر مجبور کیا۔ غالب تمام عمر قرض داروں سے چھُپتے رہے، غربت میں غالب نے جُوئے کی بیٹھک چلائی، گھر میں شراب کشید کی، مقدمات کی ذِلّت برداشت کی لیکن لوہارو خاندان کا کوئی رئیس غالب کی مدد کو نہ آیا اور نہ ہی کسی نے انگریز حکام کے روبرو ان کی پنشن کے مقدمہ میں حمایت کی۔ غالب نے ایک حد تک صبر کیا اور اس کے بعد کھلم کھلا نواب الٰہی بخش کے مقابلے پر اتر آئے۔ انھیں ہر ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن وہ ایک طویل مدت تک الٰہی بخش کی بہ نیت بد دیانتی کا خمیازہ بھگتتے رہے۔
دوسری طرف امراؤ بیگم تیز زبان اور اکھڑ قسم کی خاتون تھی، دونوں کے مزاج میں ہم آہنگی نہیں تھی، وہ غالب کے مسائل سمجھنے سے عاجز تھی۔ اس اختلاف سے جو اثرات غالب کی زندگی اور تخلیقی عمل پر مرتب ہُوئے ان کا ذکر اسی کتاب میں کیا جا چکا ہے۔
مالی دباؤ، لوہارو خاندان کی لاتعلقی بلکہ غالب سے اس کا ناروا سلوک، بیوی سے اختلاف اور عارف کے دو بچوں کا مالی بوجھ وہ واقعات تھے جنھوں نے غالب کو عصبی اور قنوطی بنا دیا تھا، وہ ہر وقت اور ہمیشہ مالی چکر میں رہتے، وہ آسودگی کے متلاشی تھے لیکن یہ ان کی زندگی میں عنقا تھی۔ غالب کی ضروریات کوئی اتنی لمبی چوڑی نہیں تھیں، وہ جس قسم کی زندگی بسر کر رہے تھے اس میں شخصیت کا مربوط ہونا ایک ناممکن سی بات تھی۔ شاید کوئی درویش ہی اپنے آپ کو ثابت و سالم رکھ سکتا۔ غالب تو بے حد کمزور شخصیت کے

مالک تھے، غالب کے بہت سے مطالبات تھے جنھیں فن کار غالب ہر وقت اور ہر لمحے پورے نہیں کر سکتا تھا۔ غالب نے ان دونوں میں کبھی ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کیونکہ ان کا فلسفہ حیات ایک کامیاب اور آرام دہ زندگی بسر کرنا تھا، اور غالب اس کے ہر قیمت دینے کے لیے تیار رہتے۔ ان کی زندگی کے واقعات نے ان کی شاعری کو بھی متاثر کیا اور ان کی مختلف شہادتیں ان کے کلام میں ان کے جذباتی رویوں میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔

لوہارو خاندان سے غالب کی وابستگی ان کی متعدد پریشانیوں کا پیش خیمہ تھی۔ غالب کا اس خاندان سے محبت اور ناپسندیدگی کا دوہرا رشتہ تھا۔ اس تعلق کے حوالے سے جو کچھ ہوا۔ اس کی تفصیل بیان کی جاچکی ہے۔ تاہم اپنی زندگی کے آخری چند سال غالب حسین علی خاں کے لیے بے حد پریشان تھے۔ ان کی ذہنی حالت بھی قابلِ رحم تھی۔ نواب رام پور کے آستانے سے اُمید لگائے بیٹھے رہے کہ حسین علی خاں کی شادی کے لیے انھیں رقم مل جائے گی اور اس طرح برادری میں ان کی شرم رہ جائے گی۔ لیکن نواب رام پور نے غالب کی التجاؤں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ غالب اپنے ہنر، مرتبہ اور نام نہاد نوابی کو بالائے طاق رکھ کر حسین علی خاں کی شادی اور ملازمت کے لیے عبرتناک حد تک اپنی تذلیل کرتے رہے۔ حسین علی خاں فاتر العقل لڑکا تھا اس کی کم سنی میں شادی اور وظیفہ کا اجرا غالب کے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ لڑکا غالب کا رشتہ دار نہیں تھا لیکن وہ صرف اپنی بیوی اور سسرال کو یہ مرعوب کرنا چاہتے تھے کہ وہ کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ دوسری طرف یہ غالب کی شخصیت کا انسانی پہلو تھا کہ وہ ایک بے سہارا فاتر العقل لڑکے کی بہتری کے لیے جگہ جگہ سبکی برداشت کر رہے تھے ــــ ایک سے زیادہ مکاتیب میں غالب نے اپنی خانگی زندگی کو موت سے تعبیر کیا ہے اور اسی طرح ان دونوں لڑکوں سے

نجات حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ غالب بہت سی چیزوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن وہ ایسی صورتِ حال کا شکار تھے کہ قوتِ فیصلہ سے محروم ہو چکے تھے جس کے نتیجے کے طور پر وہ پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے درمیان تعطل کا شکار تھے۔ اس تضادی صورتِ حال نے غالب کے لیے جو مسائل پیدا ہوئے وہ کسی فیصلہ کے بغیر تمام عمر ان میں اُلجھے رہے۔ غالب کی گرہستی ان کی زندگی کا بے حد اہم واقعہ تھا جس نے زندگی کے آخری دور میں سنکی بنا کر تخلیقی عمل سے محروم کر دیا تھا اور وہ اپنی گذشتہ تخلیقات کو حسرت سے دیکھا کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے ذہن میں کسی قسم کا کوئی ادبی منصوبہ نہیں تھا، ان کا خیال تھا کہ شاعری کی تخلیق کے لیے مالی سہولت ایک پیشگی شرط ہے، وہ اس سہولت کے لیے اس شدّ و مد سے کوشاں تھے کہ اپنے اندر کے فن کار کو بھول گئے تھے۔ وہ عدم تحفظ کا شکار تھے اور اپنی عملی زندگی میں کسی قسم کا کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ حسین علی خاں کی شادی اور وظیفہ کے لیے بار بار رامپور خط لکھتے لیکن نواب نے مکمل خاموشی اختیار کی ہوئی تھی، اسی اثنا میں قرض خواہوں نے غالب کو گھیر لیا کہ ان سے بچنا محال ہو گیا تھا، چنانچہ غالب حسین علی کو بھول کر نوابِ رامپور سے اپنے قرضے کی ادائیگی کے لیے منت سماجت کرنے لگے۔ غالب نے آخری عمر میں تین خواہشات کا ذکر کیا تھا۔

"اب اپنی حقیقت کو بیان کرتا ہوں، آخری عمر میں تین التماسیں ہیں آپ سے: ایک تو یہ کہ ہزار بارہ سو روپے کا قرض رکھتا ہوں، چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں ادا ہو جائے، التماس یہ کہ حسین علی خاں کی شادی آپ کی بخشش خاص سے ہو جائے اور سو روپیہ مہینہ جو مجھے ملتا ہے اس کے نام پر اس کے حینِ حیات قرار پائے (۱۸۶۸ء)۔

غالب کی یہ تینوں التماسیں ایک گھبرائے ہوئے دنیا دار شخص کی تھیں جس میں ایک فن کار کا حوصلہ اور صبر مفقود تھا، وہ آنے والی نسلوں کے لیے اور اپنے معاصرین

کے لیے کوئی پیغام چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور نہ ہی اپنے فن کی وراثت اور اپنی نگارشات کا کوئی منصوبہ کسی کے حوالے کرنے کے خواہشمند تھے۔ کیونکہ غالب اپنے فن سے، اپنے آپ سے اور اپنے گردوپیش کی ہر شے سے متنفر اور مایوس ہو چکے تھے۔ وہ لاولد تھے اور اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں بے حد تلخ تھے اس لیے ردعمل کے طور پر انہیں اپنی حیات بعد موت کی کوئی فکر نہیں تھی۔

غالب کی شخصیت کی تشکیل میں ان کا بچپن اور ان کے ماحول کے اثرات بے حد نمایاں ہیں، اُنھوں نے اپنے ماحول کے ساتھ کسی قسم کی مقاومت کی صورت پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

غالب ابتدا ہی سے محرومی کا شکار تھے، بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا، باپ کی جگہ چچا نے لے لی اور پھر وہ بھی چل بسے، اس کے بعد وہ اپنے ننھیال کی کفالت میں آگئے جہاں سب تنگدستی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ چنانچہ شروع سے لے کر ابتدا تک غالب احساس محرومی کا شکار رہے، ناداری اور پدری شفقت نے غالب میں عدم تحفظ کا ایسا احساس پیدا کیا تھا کہ وہ عمر بھر اس سے نجات نہ حاصل کر سکے۔ بعد کی زندگی میں نواب بننے کی خواہش، امرا اور انگریز حکام سے دوستی ان کی شخصیت کا مکافاتی عمل ہے۔ ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی بسر کرنے کی خواہش، اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں تعلی، اپنے ہنر پر بے پایاں تفخر، انگریزی کپڑے کا لباس سلوانا، غیر معمولی قسم کی ٹوپی پہننا، ولایتی شراب پینا چند ایسے واقعات تھے جو اس عہد کے لیے غیر معمولی تھے۔ غالب کے ان عوامل کی غایت اپنے آپ کو دوسروں سے متمیز کرنا تھا، غالب جو کچھ حاصل نہیں کر سکے تھے یا جو کچھ کرنا چاہتے تھے اسے وہ ایک پوز کے ذریعے بسر کر رہے تھے۔ غالب کا سارا زمانہ تصنع اور خود فریبی کا شکار تھا، سیاسی سطح پر جو کچھ ہو رہا تھا اس کے بارے میں کسی کو پَر مارنے کی مجال تھی کیونکہ ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد میں بھی انگریز حکمرانوں کا

شکنجہ بہت سخت تھا، ہر چھوٹا بڑا سر اٹھا کر نہیں چل سکتا تھا، ہر طرف دہشت اور سنسنی کا دور دورہ تھا، رہی سہی کسر ۱۸۵۷ء کے واقعہ نے پوری کر دی تھی۔ یہ سب جانتے ہی ہیں کہ دہلی میں سڑکوں پر تھا نیدار مونڈھے بچھا کر بیٹھ گئے تھے، شہر میں بسنے کے لیے ٹکٹ جاری کیے گئے تھے۔ انقلابیوں کے ساتھ جو عبرتناک سلوک کیا گیا وہ ابھی تک تاریخ کے اوراق کو ازبر ہے۔ یہ انفرادی اور اجتماعی دہشت کا زمانہ تھا جس میں کسی انفرادی یا اجتماعی اصول کے لیے اصرار ناممکن تھا۔ دہلی اور اس کے گردونواح کی آبادی یا تو انگریزوں کے گماشتوں کے طور پر کام کرتی یا ان کی وظیفہ خوار تھی۔ مخبری، شبہ اور خوشامد زندہ رہنے کے مؤثر حربے تھے۔ غالب نے حسبِ موقع ان حربوں سے کام لیا، نواب شمس الدین کا واقعہ، فری میسن کی ممبرشپ، ملکہ وکٹوریہ کے درباری شاعر بننے کی خواہش اپنی سیاسی وفاداری کو ہر شبہ اور الزام سے بری الذمہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۵۷ء کے واقعہ کے دوران غالب کی گوشہ نشینی اور دستنبو کی تحریر اس تصور کو مزید تقویت دیتی ہے کہ غالب سیاسی مصلحت کے طور پر دستنبو کی صورت میں ایک سیاسی معافی نامہ لکھ رہے تھے، لیکن بین السطور کی نوحہ گری بے حد عیاں ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بھی ایک مدت تک غالب اپنی صفائی پیش کرتے رہے "حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا۔ نکالا نہیں گیا، لٹا نہیں، کسی محکمے میں ابھی بلایا نہیں گیا، معرض بازپرس میں نہیں آیا، آئندہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔" غالب انفرادی دہشت اور اجتماعی خوف کی تصویر تھے۔ ادھر ان کی پنشن مسدود ہو چکی تھی اور اس کی ایک وجہ ان کا لال قلعہ سے تعلق تھا، اس لیے غالب ۱۸۵۷ء کے بعد ایک سہمے ہوئے شخص کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ غالب جن کی زندگی پہلے ہی عدمِ تحفظ کا شکار تھی، ۱۸۵۷ء کے بعد ایک نئے بحران سے دوچار ہوتی ہے۔ یہ بحران نفسیاتی، جذباتی اور مالی تھا جس نے انھیں جسمانی اور تخلیقی سطح پر بالکل بے جان کر دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۰ء تک غالب

بے حد پریشان حال تھے اور قرض خواہوں کے خوف سے اپنے گھر میں چھپے رہتے۔ جب تنگی ترشی بہت بڑھ گئی تو اپنے کپڑے بیچ بیچ کر گزر اوقات کرنے لگے، اس حالت کے باوجود وہ اپنے ظاہری ٹھاٹھ باٹھ برقرار رکھنے کی کوشش کرتے۔ اس طرح زندہ رہنا بے حد مشکل تھے۔ اس کے نتائج بڑی تیزی سے ان کی شخصیت پر مرتب ہونے لگے، سنکیت اور تلخی ان کے مزاج پر چھا گئی اور ان کی ظرافت بتدریج زہرخند بن چکی تھی۔ اپنی ناکامیوں کا بدلہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی ذات سے لینے لگے۔ امراؤ بیگم سے ان کی لاتعلقی بھی ان کا ایک انتقامی ردِعمل تھا۔ وہ ہر ناکامی کو اپنی قسمت اور حالات کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ وہ اپنی ذات کے مطالبات کی بجائے اپنے ''پرسونا'' متصورہ نواب کی خواہشات کی تکمیل کے لیے دل وجان کی بازی لگا رہے تھے لیکن ان کے تمام اقدام بے ثمر ثابت ہوئے تھے۔ غالب کا تاریخ اور سوشیالوجی کا مطالعہ ناقص تھا۔ انھیں یہ بھول جانا چاہیے تھا کہ انگریزوں کے پنشن خوار بادشاہ کا ملک الشعرا بننے کی خواہش ایک فریب ہے اور یہ بھی ایک خوش فہمی ہے کہ عہدِ تداخل میں کوئی شاعر صرف بطور شاعر زندہ رہ سکتا ہے۔ غالب دانستہ طور پر اس خوش فہمی میں مبتلا رہنا چاہتے تھے کہ وہ شاعر اور صرف شاعر تھے اور انھوں نے یہ رول اپنے لیے منتخب کیا تھا ــــ لیکن ہر شاعر داد کا طالب ہوتا ہے اور غالب کو عمر بھر شکایت رہی کہ ان کے ہنر کے مطابق ان کو اپنے عہد سے داد نہیں ملی۔ غالب پیشہ ور شاعر تھے جو اپنے قصیدے کا معاوضہ اور ہر غزل کی داد چاہتے تھے" خاکسار نے ابتدائے سن تمیز میں سخن سرائی کی ہے۔ پھر اوسط عمر میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے۔ نظم ونثر کا عاشق ومائل ہوں۔ ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں جہاں تک زور چل سکا، فارسی زبان میں بہت کچھ بکا۔ اب نہ فارسی کی فکر، نہ اردو کا ذکر، نہ دُنیا میں توقع، نہ عُقبی کی اُمید ــــ مَیں ہوں اور اندوہِ ناکامی جاوید۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک کم ستر برس دُنیا میں رہا۔ اب

اور کہاں تک رہو گا؟ ایک اردو کا دیوان ہزار بارہ سو بیت کا، ایک فارسی کا دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا، تین رسالے نثر کے، یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے، اب اور کیا کہوں گا؟ مدح کا صلہ نہ ملا، غزل کی داد نہ پائی، ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی۔۔۔ (۱۸۶۴ء) عمر بھر غالب کو اپنے عہد سے یہ شکایت رہی:

جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت
مَیں یوسف بہ قیمتِ اوّل خریدہ ہُوں
ہر گز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہُوں مَیں کلامِ نغز، و لے ناشنیدہ ہُوں

غالب کا اپنی ناقدری کا شکوہ کچھ مبالغہ آمیز تھا، عنفوانِ شباب میں (کلکتہ کے سفر سے پہلے) ان کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیل چکی تھی، البتہ مشکل گوئی کی وجہ سے غالب اور ان کے قارئین میں انقطاع کی صورت تھی جو غالب کے لیے تکلیف کا باعث تھی۔ دوسری طرف وہ اپنی شاعری کا مالی معاوضہ چاہتے تھے جو اس دَور میں ممکن نہیں تھا۔ تاہم غالب کو بہادر شاہ ظفر سے یا نواب رام پُور سے یا پھر غزلوں کی اصلاح سے جو ملتا وہ ان کی حیثیت کے مطابق نہیں تھا۔ تاہم اُنھوں نے حالات کی تبدیلی کے ساتھ اپنا لائحہ عمل کو بھی بدلنے کی کوشش کی، بہادر شاہ کے دربار کے زوال کے بعد انگریز انتظامیہ سے وابستگی کی پُوری کوشش کی لیکن اس میں کامیابی نہ ہُوئی۔ انھوں نے یہ بھی کوشش کی کہ قاطع برہان کو نصاب میں شامل کر لیا جائے لیکن اس میں بھی کامیابی نہ ہُوئی۔ یہ وہ چند عوامل تھے جنھوں نے مل جل کر غالب کو ملول اور شکست خوردہ بنا دیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد وہ قلبیت کا شکار ہو چکے تھے۔ وہ اپنے ہر محاذ پر مات کھا رہے تھے، ان کے اکثر دوست ۱۸۵۷ء میں مارے گئے تھے، شعر و ادب کی محفلیں اجڑ گئی تھیں، ان کی فارسی شاعری کا قاری غائب ہو چکا

تھا، ان کی تخلیقی صلاحیتیں معدوم ہو چکی تھیں، ان کے قرض خواہوں میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا، انھیں چاروں طرف بیماریوں نے نرغے میں لے لیا تھا، ان کے انگریز ممدوح ان کے وجود اور ان کی تکالیف سے بالکل بے اعتنا تھے، نواب رام پور کی سرد مہری ان کے لیے سوہانِ روح بن چکی تھی، غالب اپنی ذات اور اپنے معاشرے کی قلب ماہیت کا مکمل شعور رکھتے تھے لیکن انھوں نے اپنے بارے میں جو پوزیشن اختیار کی تھی، اپنے لیے جو رول منتخب کیا تھا اور جس طرح اپنی معروضیت سے علاقہ قائم کیا تھا، اس کا منطقی نتیجہ غالب کی وہ ذہنی کیفیت تھی جو ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے سارے وجود پر طاری رہی.
ایک شاعر جس نے زندگی بسر کرنے کے لیے شاعر رہنے کا فیصلہ کیا تھا اس کے تخلیقی سرچشمے کا خشک ہو جانا ایک بہت بڑا حادثہ تھا کیونکہ ان کا RAISON D'ETRE ختم ہو چکا تھا۔ اپنے فاترالعقل متبنیٰ کی شادی اور نوکری کا جنون غالب پر اس حد تک مسلط ہو چکا تھا کہ وہ انتہائی بیماری کی حالت میں بھی رام پور گئے، ایک چھوٹی سی ریاست کے والی کو اتنے گداگرانہ مکاتیب لکھے کہ ایک فن کار کی اَنا، ایک نواب زادہ کا افتخار سب کچھ ملیا میٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ ظاہری طور پر غالب ساختہ رجائیت کا مظاہرہ کرتے۔ میرن صاحب اور میر مہدی ایسے نابالغ اور ناپختہ چھوکروں سے گپ بازی کرتے اور مستقبل سے بے اعتنا روزانہ بنیادوں پر زندگی بسر کرتے. موت کی خواہش کرتے، ہر سال اپنی موت کی تاریخ نکالتے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے پبلک امیج کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کرتے۔ غالب ان تضادی رویوں میں شاید رہنا پسند کرتے کیونکہ ان کی قوتِ عمل ختم ہو چکی تھی اور وہ فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو چکے تھے ——
کچھ بھی ہو غالب ایک نابغہ فنکار تھے اور دنیوی مصلحتوں کی بدولت وہ ظاہرا بے حسی کا مظاہرہ کرتے لیکن داخلی طور پر وہ منہدم ہو چکے تھے۔ غالب کے یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر، کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلت

سے خوش ہوتا ہوں یعنی مَیں نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اِتراتا تھا کہ مَیں بہت بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں، آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں، لے اب تو قرض داروں کو جواب دے... آتیے نجم الدولہ بہادر ایک قرض دار کا گریبان ہاتھ میں، ایک قرض دار بھبوک سنا رہا ہے ———

مَیں ان سے پوچھ رہا ہوں، اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کبیر، روغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اُکسو، کچھ تو بولو ———

بولے کیا، بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا، کہاں سے دوں گا؟ ——— ۱۸۶۴ء

غالب جس دلدل نما صورتِ حال میں گرفتار تھے اس میں سے رہائی ممکن نہیں تھی۔ انھیں اب یقین ہو چکا تھا کہ اب اپنی بہتری کے لیے دین و دُنیا سے توقع عبث ہے، اس لیے جس طرح زندگی ہے اسی طرح قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ لیکن غالب بطورِ شاعر اپنی اس عملی بے چارگی کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور اس احتجاج کا انداز اپنی ذات کی شکست و ریخت ہے، چنانچہ اپنی ذات کی رسوائی، شکست اور تذلیل کا مشاہدہ خود ایک تماشائی کی طرح کرتے ہوئے اس سے منفک ہو جاتے ہیں، اپنی نوابی کا تمسخر اڑاتے ہیں، اپنے شاعرانہ ہنر پر طنز کرتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر انتقاماً اپنے آپ کو بے حیا کہتے ہیں۔ اپنے آپ کو غیر ذات تصوّر کرنا شخصیت کو ثنویت میں تقسیم کرنے کا عمل نہیں ہے، یہ ایک ذہنی صورتِ حال ہے، یہ ایک عارضے کا تشخص ہے، یہ ایک نتیجہ ہے اس حساس اور تخلیقی ذات کے انہدام کا جس نے مصلحت اندیشی میں اپنے

لیے وہ رول منتخب کیا جو اس کے لیے موزوں نہیں تھا۔ نواب کے "پر سونا" کا ریزہ ریزہ ہونا لازمی تھا ـــــــ

غالب ایک شاعر اداکار تھے، ان کی شخصیت میں ایک شاعر کی داخلیت بھی تھی اور ایک اداکار کی نمائش پسندی بھی۔ کھیل کے دوران ایک اداکار اپنی شخصیت کو پسِ پشت کر کے دوسرے کے کردار کو اپنے کردار کے طور پر پیش کرتا ہے، ہر کھیل میں وہ ایک نیا روپ اختیار کرتا ہے۔ بعض دفعہ وہ بہت سے کرداروں کے درمیان خود بھی ایک دوسرا کردار بن جاتا ہے۔ شاعروں، فن کاروں اور اداکاروں میں ثنویت ذات کا مسئلہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ غالب کی زندگی میں المناکی کا عنصر، ان کی شکست اور ذاتی انہدام کے پس منظر میں ثنویتِ ذات کا ایک ایسا کھیل تھا جس میں غالب خود بے بس تھے۔ وہ اپنی شاعرانہ شخصیت اور شہر کی عظمت کا اعتراف چاہتے تھے، انھوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ فنی عظمت کے اعتراف کے لیے معاشرتی امتیاز ضروری ہے۔ غالب کی پرورش جس آب و ہوا میں ہوئی تھی اس میں ہر کوئی معاشرتی امتیاز کا دعویٰ دار تھا۔ غالب کو یہ سہولت تھی کہ ان کا جاگیرداروں سے ایک بالواسطہ تعلق تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی شاعرانہ عظمت کے اعتراف اور اپنی عملی زندگی کے معاملات کو سلجھانے کے لیے اپنے نواب ہونے کا دعویٰ کیا، انھوں نے اپنے شجرۂ نسب اور موجودہ صورتحال کو اس طرح بیان کیا کہ ان کے معاصر بن واقعی ان کو نواب تصور کرنے لگے۔ غالب بے تحاشا ذہین شخص تھے۔ انھوں نے بتدریج ایک نواب کی تمثال کو اپنانے کا فیصلہ کیا، اس میں ان کی چھوٹی اَنا کی تسکین تھی اور ان کی متصورہ زندگی کا نقش بھی موجود تھا۔ انھوں نے اپنی وضع قطع میں خصوصی اہتمام سے کام لیا، اپنی بود و باش میں بھی طمطراق پیدا کیا، ایک کی بجائے دو حویلیوں میں رہائش رکھی، نصف درجن کے قریب ملازم رکھے، کسی کو دیوان کا منصب دیا، کسی کو داروغہ بنایا، پالکی کے لیے کہار رکھے، انگریزی

شراب، انگریزی کپڑے یہ بود و باش، یہ اہتمام، نوابی زندگی کی یہ تمثال وُہ "پہ سونا" تھا جس کے ذریعے غالب اپنی خارجیت سے ربط قائم کرنا چاہتے تھے، یہ وہ رول تھا جو ایک شاعر اداکار بن کر ادا کر رہا تھا۔ غالب جس سٹیج پر یہ نواب شاعر کا کھیل پیش کر رہے تھے اس کے پس منظر میں دہلی کے بے وفا، بے یقین، قلاش جاگیردار اور نواب فرار کی زندگی بسر کر رہے تھے، غالب ان میں شامل ہونا چاہتے تھے، وہ ہر قیمت پر اپنی متصورہ زندگی کے ہیولے کو عملی طور پر بسر کر رہے تھے۔ غالب کو اس طرزِ زندگی کی کیا قیمت ادا کرنی پڑی؟ یہ وہ حکایتِ خونچکاں ہے جو مکاتیبِ غالب کا متن ہے۔ یہ ایک ہنستے کھیلتے ہوئے چہرے کے عقب میں ذاتی ضمیر کی شکست کا نوحہ لیے ہوئے ہے۔ غالب ایک خوشحال زندگی چاہتے تھے، غالب حکام کی نگاہ میں ممتاز شہری اور عظیم شاعر کے طور پر نمودار ہونا چاہتے تھے، وہ ہر معاملہ میں تفوق کے خواہش مند تھے، غالب نے اس ہدف کے لیے بہت تگ و دو کی لیکن انجام کار یہ سب کچھ سعیِ لاحاصل تھا، غالب موت سے قبل مقروض تھے، تخلیقی اعتبار سے انجماد کا شکار تھے، اور اپنی ادبی فتوحات سے بھی متنفر ہو چکے تھے "کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، رُوح سے نفرت"۔ اداکار نے شاعر کو پس پشت کر دیا تھا۔ وہ شاعری کی تخلیق کے لیے مالی آسودگی کو ایک شرط تصوّر کرتے تھے۔ غالب کو مالی سہولت میسّر نہ آئی اس لیے انھوں نے شاعری کی تخلیق سے کنارہ کشی کر لی، وہ لکھنا چاہتے لیکن قلم دماغ کا ساتھ نہ دیتا تھا۔ شاعر غالب کو اداکار غالب نے شکست دی۔ ایک دن اداکار غالب کو یکایک محسوس ہُوا کہ کھیل کا پردہ گر گیا ہے، سٹیج منہدم ہو چکی ہے اور وہ اس ملبے کے درمیان بے یار و مددگار بیٹھے موت کے طالب ہیں۔ ان کی قوتِ ارادی بیماری، اور احساسِ شکست کے باعث ختم ہو چکی ہے۔ مذہب اور دوسری اقدار بھی اس وقت اُنھیں سہارا نہیں دے سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ

لایعنی زندگی جو غالب نے ایک شعوری انتخاب کے طور پر بسر کی تھی غالب کے مختل حواس، بے بسی اور روحانی علالت میں انجام کو پہنچی، وہ اپنے آپ کو گورنمنٹ کا بھاٹ کہنے لگے جسے نہ قصیدے کا صلہ ملا نہ غزل کی داد۔

"دم غنیمت ہے۔ جان ہے تو جہاں ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا سے نا اُمیدی کُفر ہے۔ مَیں تو اپنے باب میں خدا سے نا اُمید ہو کر کافر مطلق ہو گیا ہُوں۔ موافق عقیدہ اہلِ اسلام جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھئی نہ دنیا نہ دین ——— "۶

غالب کی غزل

غالب کے لیے شاعری ناگزیر تھی، کیونکہ یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا انتخاب تھا۔ یہ ان کا ذریعہ معاش بھی تھی اور ان کی اَنا کا افتخار بھی۔ انھوں نے ساری عمر شاعری کے سوا کچھ نہیں کیا۔ وہ دو لسانی شاعر تھے جس زبان کو وہ حقیر جانتے تھے اسی نے اُنھیں شہرتِ عام اور بقائے دوام دی، جس شاعری پر وہ تفخر کرتے تھے وہ ان کی زندگی میں ہی اخفا میں چلی گئی —— غالب کا عہد ہر اعتبار سے بے ثمر تھا، ہر رسم کہنہ تیزی کے ساتھ محو ہو رہی تھی، شعر و شاعری تو بہت دُور کی بات تھی۔ دہلی شہر میں ہی دو حکومتیں قائم تھیں، اور لوگ ان دونوں کے، کسی وفاداری کے بغیر تماشائی تھے، ایسے پُر آشوب دَور میں ہمہ وقتی شاعر ہونے کا فیصلہ کرنا ایک عذاب کو گلے لگانا تھا ان دونوں حکومتوں سے داد اور صلے کی خواہش ایک عجیب و غریب ضمیر کی کشمکش کی مظہر تھی۔

غالب کی شاعری ایک حوصلہ شکن ماحول میں ایک شخصی فیصلہ پر کاربند رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ غالب ۵۵ برس تک شعر و ادب کی وادی میں سرگرداں رہے لیکن وہ ایک دل گرفتہ اور روٹھے ہوئے شخص کی طرح کوئی نصیحت اور وصیت کیے بغیر اس جہان سے کوچ کر گئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد وہ حالات سے برگشتہ، اپنے آپ سے بیزار اور شاعری سے متنفر ہو چکے تھے۔ شخصی رنجشوں نے انھیں ذہنی طور پر بنجر کر

دیا تھا۔

غالب نے فارسی میں دس ہزار کے قریب شعر کہے تھے۔ اُردو میں بھی انھوں نے ایک مفصل دیوان لکھا تھا لیکن اس میں اتنی حک واصلاح کی کہ وہ ایک مختصر سا دیوان زادہ بن گیا۔ غالب نے اپنی اُردو شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ وہ ۱۸۳۰ء سے ۱۸۵۷ء تک فارسی میں ہی شعر کہتے رہے، چند غزلیں بہادر شاہ ظفر کے مشاعروں کے لیے اور زندگی کے آخری دس سالوں میں بھی تین چار غزلیں ضیاالدین وغیرہ کے کہنے پر لکھیں۔ غالب کا خیال تھا کہ ان کے عہد میں ان کے پایہ کا فارسی زبان میں کوئی شاعر نہیں تھا، اس لیے انھیں اپنی فوقیت کو برقرار رکھنا تھا، چنانچہ وہ اپنی فارسی شاعری کا پرچار زیادہ کرتے اور زیادہ سے زیادہ شعر اسی زبان میں کہتے —— غالب انگریز حکام کے قصائد بھی فارسی میں لکھتے۔ ملکہ وکٹوریہ کو فارسی زبان کی شُدبُد تھی، اس نے فارسی سیکھنے کے لیے ایک اتالیق بھی رکھا ہُوا تھا۔ غالب ملکہ وکٹوریہ کے دربار کے ملک الشعرا بننا چاہتے تھے۔

غالب نے کم و بیش تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی لیکن ان کا اصل ہنر ان کی اُردو غزل میں نمایاں ہوتا ہے۔ غالب کی اُردو غزل کا قصہ بھی دلچسپ ہے اُردو کے محققوں نے کافی تگ و دَو کے بعد ان کی شاعری کے مختلف ادوار قائم کیے ہیں۔ یہ کام مشکل تھا کیونکہ غالب کا اُردو شاعری کی تخلیق کا عمل بڑا بے قاعدہ تھا۔ ۲۷/۲۸ سال کی عمر تک باقاعدہ اُردو میں شعر کہتے رہے، پھر ۲۰/۲۲ سال فارسی کے پیچھے لگے رہے، اگر یہ اندازہ غلط نہیں تو غالب نے دربارِ دہلی سے وابستگی کے دوران ۶/۷ اُردو غزلیں لکھیں اور اتنی ہی غزلیں بعد کے دَور میں مختلف لوگوں کی فرمائش پر تحریر کیں۔ ان کے علاوہ متفرق اشعار ان کے مکاتیب میں بھی دستیاب ہیں۔ غالب کے کلام کا نسخہ عرشی کافی ضخیم ہے، اس میں غالب کا تمام اردو کلام کم و بیش موجود ہے۔ غالب کی زندگی میں ان کے دیوان کے نو نسخے تیار ہُوئے اور دسواں نسخہ خود غالب نے مرتب کیا تھا۔

غالبیات کے ماہرین نے ان نسخوں کو سامنے رکھ کر کلامِ غالب کے مختلف ادوار قائم کیے ہیں۔ کلامِ غالب کی ارتقائی ترتیب میں اس لیے دشواری پیش آئی ہے کہ غالب کے فارسی اور اردو کلام کے تخلیقی ادوار آپس میں خلط ملط ہیں۔ اس حد بندی میں ایس ایم اکرام کی مساعی ابھی تک مستند ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں بیاضِ غالب کی اشاعت کے بعد کلامِ غالب کے مختلف ادوار کے بارے میں نظرِ ثانی کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔

بیاضِ غالب ۱۸۱۶ء میں غالب نے مبینہ طور پر مرتب کی تھی، اس وقت ان کی عمر ۱۹ برس تھی۔ اس بیاض میں ۲۵۲ کے قریب اُردو غزلیں، ان کے علاوہ فارسی اور اُردو کی رباعیات اور متفرق اشعار درج ہیں۔ اگر یہ بیاض واقعی مستند ہے تو غالب کی فارسی اور اُردو زبان پر حیرت انگیز گرفت ہے اور جن کی ابتدائی شاعری میں اُستادانہ مہارت کا رنگ جھلکتا ہے۔ غالب نے اپنی اس بیاض کا کہیں ذکر نہیں کیا بلکہ مکرر بار انھوں نے لکھا ہے کہ ان کا کلام ان کے دوست جمع کیا کرتے تھے۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق اُنھوں نے پندرہ برس کی عمر سے لے کر پچیس برس کی عمر تک خیالی مضامین کو نظم کیا اور بعد میں اس شاعری کو رد کر دیا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ غالب نے پندرہ سے انیس سال کی عمر تک یعنی چار سالوں میں استادِ مجموعہ کلام تحریر کیا ہو۔ بہر کیف نسخہ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی میں درج غالب کے ابتدائی کلام کو، جو انھوں نے کم عمری میں نظم کیا، ایک نابغہ کی شاعری میں لسانی مشقوں سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔

غالب کی ذہنی نشو و نما میں کلامِ بیدل کا ذکر کیا جاتا ہے۔ غالب خود بھی لکھتے ہیں کہ مجھے رنگِ بہارِ ایجادی بیدل پسند آیا، غالب اس پسندیدگی کی وجہ بیان نہیں کرتے۔ کیا غالب پیچیدگی اور نازک خیالی کو شاعری سمجھتے تھے؟ کیا وہ اپنے معاصر شعرا میں بہ وصف پیچیدگی ممیز ہونے کے خواہش مند تھے۔ اس سوال

کا جواب فراہم کرنا مشکل ہے۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب زبان سازی کے ذریعے غزل میں تشکیلِ معنی چاہتے تھے، وہ اُردو غزل کو ایک مرتبہ پھر فارسی غزل کے ماڈل پر وضع کرنے کی کوشش میں مصروف تھے، چنانچہ انھوں نے نئی لغت کو استعمال کرنے کی بجائے کلاسکی فارسی شاعری کے لسانی مرکبات کو از سرِ نو رائج کرنا چاہا۔

غالبؔ کے ایک شاگرد صفیرِ غالب کی زبان سے ان کا نظریۂ شعر بیان کرتے ہیں۔

"ہماری دِلّی اس بات میں پیچھے رہی کہ مضمون کے آگے زبان کی درستی نہ کی اور مضمون میں بھی عاشقانہ کا زیادہ خیال رہا۔ . . . میں نے بھی ایک طرزِ خاص ایجاد کیا تھا جس میں ہر طرح کے مضمون کو نشو و نما ہو سکتا تھا مگر یاروں نے چلنے نہ دیا۔ اور سچ پوچھو تو یہ ایجاد ناسخ کا ہے۔ میاں جب کلام ناسخ کا دلی میں پہنچا، جیسا کہ تم نے ولی کے دیوان کا حال سُنا ہو گا کہ دلی میں آیا تو جیسے نئی چیز پر لوگ گر پڑتے ہیں، اس طرح اس کے کلام پر گر پڑے . . . ."

غالب کا اپنی شاعری کے بارے میں یہ بیان عجیب و غریب ہے۔ ناسخ ادنیٰ درجہ کا شاعر تھے اور آزاد کی لغت میں لفظوں کے طوطے مینا بناتے تھے۔ ان کے کلیات میں شاید ایک آدھ ہی غزل کام کی ہو، ان کا کلام محض آورد ہے، لفظوں کی تراش خراش ہے۔ غالب کو نہ جانے اس کے کلام میں کونسی بات پسند آئی کہ وہ ناسخ کے گرویدہ ہو گئے۔ دیوانِ ولی اور دیوان ناسخ کا تقابل ایک بے تکی سی بات ہے۔ دیوانِ ولی میں ایک لسانی اور موضوعاتی تازگی تھی، جب کہ دیوانِ ناسخ میں معانی سے تہی زبان سازی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ شاید غالب یہ کہنا چاہتے تھے کہ انھوں نے ہر طرح کے موضوع کے اظہار کے لیے ایک زبان ایجاد کی تھی لیکن وہ قبولِ عام حاصل نہ کر سکی۔ اُردو غزل کی روایت میں غالب وہ لسانی پوزیشن حاصل کرنا چاہتے تھے جو دیوانِ ولی کو حاصل تھی۔ مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ کلامِ ولی اُردو غزل میں فارسی غزل کے اسلوب کی بالادستی ختم کرنے کا پہلا محکم

تجربہ تھا۔ ولی سے غالب تک پہنچتے پہنچتے اُردو غزل کے علائم و رموز اس کا لسانی لب و لہجہ STATIC ہو چکا تھا اور اس میں نئے معانی کی گنجائش نہیں تھی۔ غزل کا شاعر اپنے آپ کو چند محدود عشقیہ واردات کا پابند کرنے پر مجبور تھا۔ غالب کے دہلی اور لکھنؤ میں معاصر شعرا جس قسم کی مصنوعی، جذبات سے عاری اور لغو شاعری کر رہے تھے وہ ان شعرا کی ذہنی حالت کی نمایندہ تو کہلا سکتی تھی لیکن وہ اچھی یا اعلیٰ درجہ کی شاعری کے دائرے سے بالکل خارج تھی۔ اُردو غزل کے اس تناظر میں غالب کی شاعری نہ صرف جذباتی زیلیف مہیا کرتی ہے بلکہ اُردو غزل کو تجربہ کی سطح پر ایک نئی رفعت پر لے جاتی ہے۔ غالب مصنوعی واردات اور بنے بنائے لسانی اسلوب سے انحراف کرکے غزل کو محسوس واردات کی شاعری بناتے ہیں۔

غالب نے مثنوی، قصیدہ اور رباعی میں بھی طبع آزمائی ہے لیکن غزل ان کا حقیقی میدان ہے جہاں وہ اُردو غزل کی روایت کی جکڑ بندیوں کے باوجود اپنا ایک خصوصی اسلوب وضع کرتے ہیں۔ غزل میں غالب کی عظمت کی بنیاد رنگِ بیدل کی بدولت نہیں ہے اور نہ ہی اس مفرس اسلوبِ غزل کے حوالے سے ان کا ہنر نمایاں ہوتا ہے۔ غالب کی غزل کا امتیاز وہ جذباتی سطح ہے جسے غالب نے اپنے تجربے کے ذریعے دریافت کرکے اردو غزل کو ایک نیا جذبی اور حسیاتی رنگ دیا ہے۔ دوسری طرف انھوں نے غزل کے محدود دائرے میں رہتے ہُوئے بھی اُردو کے تمام غزل گو شعرا کی نسبت زیادہ سے زیادہ تجربات اور احساسات کو غزل میں شامل کیا ہے۔ اور ان کی غزل کی معنوی رینج بے حد کشادہ ہے۔ جو شاعر روایتی اسلوب غزل کے ذریعے اپنے تجربات کو پیش کرتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک اسیر کی ہے جو موضوع سے لے کر اظہار تک بہت سی رسوم کا پابند ہوتا ہے۔ معنی کی تعمیر کی بجائے اسے صرف پیش کرتا ہے۔ غالب کا امتیاز یہ ہے کہ ان کی غزل تشکیل معنی کے ذریعے تکمیل پاتی ہے، وہ کسی جذباتی حالت کو براہ راست

پیش کرنے کی بجائے اسے ایک لسانی ڈیزائن کے ذریعے نمایاں کرتے ہیں جس میں وہ الفاظ کی مروجہ معنوی دلالتوں پر اعتماد کرنے کی بجائے الفاظ سے زیادہ معنوی توقعات وابستہ کرتے ہیں۔ اس نوع کی غزلیات میں فن کارانہ صناعی اور جذبے اور جذبے کی شدت ایک دوسرے کا جزو بن جاتی ہیں۔ غالب کی غزل کا ایک شیوہ جذبہ اور تصور کی آمیزش ہے جس میں تجربہ بیک وقت جذباتی اور عقلی سطحوں پہ سفر کرتا ہے۔ غالب کے سوا یہ وصف اُردو کے کسی دوسرے غزل گو شاعر کے یہاں دستیاب نہیں ہے۔ اُردو کے عام نقادوں کو یہ مغالطہ ہوا ہے کہ غالب کی شاعری میں فلسفیانہ افکار ملتے ہیں۔ فلسفیانہ شاعری یا شاعری میں فلسفیانہ عنصر کی موجودگی ایک طویل اور متنازعہ بحث ہے۔ غالب کے یہاں حیات و کائنات کے بارے میں کوئی مربوط نظامِ فکر یا رویہ موجود نہیں ہے۔ وہ حیات، موت اور دیگر مظاہرِ حیات کے بارے میں مابعد الطبیعاتی استفسارات کرتے ہیں ان میں استفسارات کی نوعیت وہی ہے جو ہمیں فارسی اور اُردو کی صوفیانہ اور مابعد الطبیعاتی شاعری کا عمومی موضوع ہیں۔ وہ البتہ استفسارات کے جذباتی حوالے نظر انداز نہیں کرتے۔

غالب بنیادی طور پر ایک خصوصی جذباتی لہجے کے شاعر ہیں اور ان کی غزلیات میں کہیں کہیں نظری SPECULATIVE اشعار بھی ملتے ہیں۔ جن سے یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ فلسفیانہ شاعر ہیں۔ ان کے یہاں اگر ہستی کو فریب سے تعبیر کیا گیا ہے تو اُردو کے نقادوں نے اس کے قلابے نہ جانے کہاں کہاں ملائے ہیں۔ دیوان میں تین طرح کی غزلیات دستیاب ہیں۔ پہلی نوع کی غزلیات میں رنگِ بیدل کا تتبع کیا گیا ہے جن میں غالب کی تمام تر کوشش فارسی اور اُردو کے امتزاج سے غزل میں ایک نیا لسانی اسلوب تعمیر کرنا ہے، اور اپنے تجربہ کو پیچیدہ سے پیچیدہ بنانا ہے۔

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے
دعویِ جمعیتِ احباب، جائے خندہ ہے

تا کجا اے آگہی، رنگِ تماشا باختن؟
چشمِ وا گر دیدہ، آغوشِ وداعِ جلوہ ہے
شمارِ سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا

دیوانِ غالب میں اس نوع کی غزلیں اس اعتبار سے معنی سے تہی نہیں، ان میں معنی تلاش کیا جاتا ہے۔ ان میں معانی کی تعمیر یا تجربے کی تشکیل کی بجائے صرف لفظی صناعی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ ... اس نوع کی غزلیں آورد کا نتیجہ ہیں، یہ جذبہ کی حرکت سے عاری ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے کہ کھینچا تانی کے ذریعے شعر بنائے گئے ہیں۔ یہ غزلیں غالباً وہی ہیں جن کے بارے میں غالب نے کہا تھا کہ انھیں نمونے کے طور پر دیوان میں شامل کیا گیا ہے۔

دیوانِ غالب میں دوسری نوع کی غزلیں روایتی قسم کی ہیں۔ ان میں جن معاملاتِ عشق کا بیان ہے، وہ پیش پا افتادہ ہیں، جو اردو غزل کی روایت سے مغلوبیت کا نتیجہ ہیں یہ غالب کے ذہنی تساہل کی پیداوار ہیں۔ یہ غزلیں غالب کے ادبی قدوقامت کو متاثر کرتی ہیں۔

دل دیا جان کے کیوں، اس کو وفادار اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

یَں اُنھیں چھیڑوں اور کچُھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیئے ہوتے

لاغر اتنا ہُوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

غُنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یُوں
بوسے کو پوچھتا ہُوں مَیں مُنہ سے مجھے بتا کہ یُوں

دیوانِ غالبؔ میں ایسے اشعار بھی دستیاب ہیں جن میں غالبؔ کا تجربہ مستعار ہے۔ ایسے اشعار میں بنی بنائی واردات اور روایتی قسم کے لب ولہجہ کا سہارا لیا گیا ہے بعض غزلیات مکمل طور پر روایتی ہیں اور بعض غزلیات میں اچھے شعر بھی ہیں۔ اگر ایسے اشعار کو دیوان سے خارج کر دیا جائے تو غالب کی شعری حیثیت متاثر نہیں ہوتی۔ پہلی اور دوسری قسم کی غزلیات میں غالب ایک کبیر شاعر کے طور پر نمودار نہیں ہوتے! اوّل الذکر قسم کے اشعار اور غزلیات ان کی ذاتی بوالعجبی کا نتیجہ ہیں، اور دوسری قسم کے اشعار روایت کے اثر کی پیداوار ہیں۔

دیوانِ غالب میں تیسری قسم کی غزلیں وہ ہیں جن میں غالب اپنے تجربات کو غزل کا موضوع بناتے ہیں، اپنی بصیرت، مشاہدہ اور فن کارانہ مہارت کا بیک وقت مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس نوع کی غزلوں میں غالب ایک جذباتی ردیے کے ساتھ اپنی ذات کو اپنی زندگی اور اپنی معروضیت سے مربوط کرتے ہُوئے دکھائی دیتے ہیں۔ غزل کی شاعری میں تجربے کی کلیت کا ادراک ممکن نہیں ہے، زندگی اور انسان ریزہ ریزہ ہوکر غزل کے اشعار میں نمودار ہوتے ہیں۔ غالب کی تیسری قسم کی غزل کو

FELT EMOTIONS کی شاعری کہا جاسکتا ہے۔ ان میں تین طرح کے بنیادی تجربات ہیں جو ایک سطح پر شاعر کے شعور سے متصل ہوتے ہیں۔ تنہائی، قسمت کی جبریت حزن اور فنا غالب کی غزلیات کا موضوع بنتے ہیں ان اشعار کے حوالے سے غالب کا کلام ان کی شخصیت اور ان کے عہد سے متصل ہوتا ہے۔ غالب کا عہد انفرادی اور معاشرتی تنہائی کا عہد تھا۔ حزن اور فنا کی خواہش اس عہد کی سیاسی صورتِ حال اور قدیم نظام اقدار کے انہدام کا نتیجہ تھا۔

دیوانِ غالب میں بھرتی کے اشعار کافی تعداد میں ہیں یعنی وہ غزلیں اور اشعار جن میں غالب نے تن آسانی سے کام لیا ہے اور روایتی موضوعات کو اپنے تجربات کی بنیاد بنایا ہے۔

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یُوں تشنہ لب پیغام کے (پُوری غزل)

عاشق ہُوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ میرے آگے

بیچارہ اے دلِ وابستہ، بیتابی سے کیا حاصل؛
مگر پھر تابِ زُلفِ پُرشکن کی آزمائش ہے

واعظ نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی

غالب کے عشقیہ تجربات بھی عاشق، محبُوب اور رقیب کی روایتی تثلیث سے مرتب ہوتے ہیں۔ ان کا عشق بھی ہجر سے تقویت حاصل کرتا ہے، ان کا عاشق بھی

ستم زدہ ہے، اور اس کا ماحول عشق میں اس کی رسوائی کا منظر دیکھ رہا ہے۔ غالبؔ یکایک انھیں روایتی موضوعات کے دائرے میں اپنی جذباتی قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں، ان کی متخیلہ حرکت میں آتی ہے، ان کی حسیات زیادہ شوخ ہو جاتی ہیں، ان کی شاعرانہ مہارت اپنی رفعت کا مظاہرہ کرتی ہے، اور وہ غزل کے مروجہ مضامین میں اپنا جذبہ دریافت کرتے ہیں، دیوانِ غالب کی ردیف "ی" اور "ے" میں غالب کی بہترین غزلیات شامل ہیں۔

غالب تغزل کی روایت کو نبھاتے ہوئے بھی اپنے انفرادی احساس کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی غزل میں اردو غزل کلاسیک کا درجہ پاتی ہے، غالب اردو غزل کے لسانی اور معنوی اسلوب کے جملہ امکانات ختم کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ غالب کی غزل کا تیسرا رنگ ان کی غزلیات کے پہلے دو رنگوں سے مختلف ہے، ان غزلیات میں غالب کی شخصیت، ان کا عہد اور ان کی شاعری ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتے ہیں ــــــ غالب کے عہد کی ویرانی، عشق میں ہجر کی کیفیت، ان کی ذاتی تنہائی اور خواہش مرگ ان کی غزل میں ایک المیہ رویے کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں۔ اور غالب اپنے عہد کا ادراک ایک ویرانے کی صورت میں کرتے ہیں۔ وہ عاشق جو لطف خرام ساقی ذوقِ صدائے چنگ کا دلدادہ ہے، یکایک ایک المیہ کردار بن جاتا ہے جو اپنی ذات کے انہدام اور اپنی شکست میں اپنی حقیقت کی معنویت جاننا چاہتا ہے، یہی عاشق اپنے محبوب کے ہاتھوں قتل ہونے کا متمنی ہے کہ وہ موت کے ذریعے ہی محبوب کی ذات میں جذب ہو سکتا ہے، یہاں غالب کا فکری رویہ مروجہ مابعدالطبیعاتی تصورسے مربوط ہو جاتا ہے۔ وہ عشق کے مصائب جھیلتا ہے کہ عشق اس کی ذات اور اس کے عہد کو منکشف کرتا ہے۔ لیکن عشق ایک تقدیری آفت بھی ہے جو عاشق کو پیہم مضطرب رکھتی ہے۔ اضطراب اپنی ذات کا شعور ہے، اپنی معنویت کی تلاش

ہے۔ لیکن غالب کا عہد بے ثمر تھا کیونکہ وہ ایک آسیب کی زد میں تھا:

رات دِن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دِل
انسان ہُوں، پیالہ و ساغر نہیں ہُوں مَیں

ع اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشا کر

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ مردہ ہوں مَیں بے زباں، گورِ غریباں کا

ع نظر میں ہے ہماری، جادۂ راہِ فنا غالبؔ

ع فنا تعلیمِ درسِ بے خودی ہوں اسے زمانے سے

ع فنا کو سونپ اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا

ع موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

شہادت تھی مری قسمت میں، جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا، جھکا دیتا تھا گردن کو

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

سر گشتگی میں، عالم ہستی سے یاس ہے
تسکین کو نوید کہ مرنے کی آس ہے

بہت سہی غم گیتی، شراب کم کیا ہے

غالب اپنی زندگی میں جتنی خوش باشی کا مظاہرہ کرتے تھے داخلی طور پر اتنے ہی ملول تھے، ان کی زندگی ایک مسلسل ہزیمت تھی، وہ جو کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے وہ ان کی بساط سے باہر تھا، ان کی خواہشوں اور ان کی عملی زندگی میں ایک واضح بُعد تھا، اجتماعی سطح پر پژمردگی اور آدرش سے خالی معاشرے میں ایک تخلیقی شعور زندگی کی عملیات سے دستبردار ہوکر فرار کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ غالبؔ کی غزلوں میں ویرانی اور تنہائی رومانوی طبیعت کا نتیجہ ہونے کی بجائے ایک تمدن کی ویرانی کا تجربہ ہے جس میں فنا، موت اور شکستِ ذات حقیقت سے فرار کے راستے ہیں۔ غمِ پنہاں، کشمکش، گھر کی بے آبادی، فنا کی خواہش، افسردگی کی تمنا، محبوب کے حضور میں ذلّت کی خواہش، لوگوں میں رسوائی پر فخر، ہجر کی حالت میں جسم و جان کا دکھ اُٹھانا، بے ثباتی، زندگی کو فریب کہنا، محض انفرادی نسبت یا نفسیاتی صورتحال نہیں ہے،

یہ ایک ایسی ذات کا تجربہ ہے جو ایک تمدنی حادثے کا شارح بن جاتا ہے، یہی وہ لمحہ ہے جہاں غالب کی غزل عاشقانہ واردات سے متجاوز ہوکر ایک تاریخی پس منظر کی نشاندہی کرتی ہے۔ چنانچہ غالب جن سات آسمانوں کی گردش یا پہیلے کی گردشِ مدام

کا ذکر کرتے ہیں، وہ علامتی ہونے کی بجائے واقعاتی بن جاتی ہے اور ہم غالب کے ذاتی الم اور نوحوں میں ایک عہد اور ایک تہذیب کی المناکی کا ادراک کرتے ہیں۔ یہ غالب کی غزل کا خصوصی رنگ ہے۔ وہ اپنے المیہ کو، عاشق کے دُکھ اور اپنے عہد کی بے بسی سے متصل کر کے ایک دلگداز المناکی کا راگ الاپتے ہیں:

غالب کی غزلیں (وہ جن میں غالب رنگِ بیدل یا روایتی غزل سے گریز کرتے ہیں۔) ایک سے زیادہ معنی کا قرینہ مرتب کرتی ہیں کیونکہ غالب ترسیل معانی کی بجائے تشکیل معانی کے عمل پر اعتماد کرتے ہیں، اس عمل میں وہ استعارہ سازی اور تمثال آفرینی سے مدد لیتے ہیں، اس لیے ان کی غزلوں کی معنویت متغیر ہوتی رہتی ہے۔

یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ غالب اُردو کے واحد غزل گو شاعر ہیں جن کی غزلیں کثیر المعانی ہیں اور انھوں نے ایک مختصر سے دیوان میں اردو کے تمام غزل گو شعرا کی نسبت زیادہ سے زیادہ تجربات کو غزل کا موضوع بنایا ہے۔ غالب کی فنی مہارت یہ ہے کہ وہ غزل کے معین علائم و رموز کے دائرے میں رہتے ہُوئے بھی ان سے گریز کر جاتے ہیں، اس طرح وہ الفاظ کے نئے تضمن وضع کرتے ہیں۔ چنانچہ رنگِ بیدل کے زیرِ اثر مصنوعی زبان سازی کی بجائے ایک نئی جاندار شعری لُغت جنم لیتی ہے جس میں کلاسیکی غزل کی انتہا اور نئی غزل کے اسلوب کے اشارات موجود ہیں۔

دیوان غالب، ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں ایک نابغہ کا ارفع اور ادنیٰ دونوں طرح کا کلام موجود ہے۔ غالب نے اپنے کلام کے انتخاب میں ایک طویل عرصہ بسر کیا لیکن انھوں نے اپنے کلام کا کچھ رطب و یابس بھی اس دیوان میں شامل کیا ہے اور اپنے کلام کا ایک بہتر حصّہ دیوان سے باہر رکھا ہے۔ دیوانِ غالب ایک شاعر کا ذاتی

انتخاب ہے جس میں اس کے تمام تعصبات اور انتخاب کے عصری تقاضے شامل ہیں۔ تحسینِ کلام غالب کے لیے ضروری ہے کہ غالب کے اُردو کلیات میں سے ایک معروضی انتخاب تیار کیا جائے، جو تحسینِ غالب کا بہتر اور مکمل زاویہ فراہم کرسکے۔

غالب کی نثر

غالب ایک موجد اور معمار انشا پرداز تھے جن کا ابھی تک نثر میں کوئی ثانی پیدا نہیں ہُوا ہے ۔ شعری ہنر کے اعتبار سے میر تقی میر اور میر انیس غالب کے رقیب (RIVALS) ہیں لیکن نثر میں، اتنی مدت گزر جانے کے، کوئی ان کی ہمسری کا داعی نہیں ہے۔ ادبی تاریخ کے اعتبار سے غالب کی نثر ان کی شاعری پر فوقیت رکھتی ہے۔ بیسویں صدی کی اُردو شاعری میں اقبال غالب کی نسبت شاعری کو ایک نئی رفعت کی طرف لے جاتے ہیں۔ غالب کی نثر کو ان کی شاعری کے مقابلے میں انڈر پلے کیا گیا ہے۔ شاید اس لیے کہ حالیؔ نے غالب شناسی کا جو زاویہ اُردو ادب کو دیا ہے اُردو تنقید نے اس سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا، انھوں نے رسمی القابات کو یکسر ترک کر دیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ تنقید کے اس اسلوب نے غالب کے عظیم الشان اسلوبِ نثر اور ان کی اصل شخصیت کو منظر عام پر نہیں آنے دیا، دوسری طرف مروجہ اُردو تنقید نے غالب کے نثری کارنامے کو ان کی ذات اور ان کے عہد سے جُدا کر کے دیکھا ہے۔

تحقیقی نقطہ نظر سے غالب کے مکاتیب کی تلاش اور دریافت پر کافی محنت کی گئی ہے اور اس ضمن میں امتیاز علی عرشی کا نام لائق احترام ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق غالب نے ۶۰۰ سے زائد مکتوب لکھے ہیں۔ ان کے مکاتیب

کا پہلا مجموعہ ان کی زندگی میں ۱۸۶۸ء میں عودِ ہندی کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ان کے مکاتیب کا دوسرا مجموعہ ان کی وفات کے ایک دو ماہ بعد اُردوئے معلّٰی کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔ اُردوئے معلّٰی کی جلد دوم حالی نے ۱۸۹۶ء میں مرتب کی۔ گزشتہ ۸۰ سالوں سے غالب کے مکاتیب کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں مگر سب ایڈیشن تاریخی شتر گربگی کا شکار ہیں۔ کسی مرتب نے ان میں تاریخی تسلسل قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس عدمِ تسلسل کے نتیجے کے طور پر غالب کے مکاتیب سے ان کی زندگی کے مسائل اور ان کے نفسیاتی توجہات میں کوئی ربط قائم ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ مکاتیبِ غالب کی بہت سی حیثیتیں ہیں، یہ ایک نابغہ فنکار کی خود نوشت کا درجہ رکھتے ہیں، یہ ایک عہد کی جذباتی اور سیاسی صورتحال کا پتہ دیتے ہیں، یہ زبان کی تشکیل کے عمل کی اطلاع دیتے ہیں۔

غالب کی تمام سوانح عمریوں کی بنیاد ان کے مکاتیب ہیں۔ غالب بڑے محتاط فن کار تھے۔ وہ اپنی ادبی شخصیت کی پوری طرح حفاظت کرتے تھے، مکاتیبِ غالب میں جو زبان و بیان کی اور موضوع کی برجستگی نظر آتی ہے وہ ایک نابغہ فن کار کی مہارت ہے، یہ مکاتیب ایک خصوصی ڈیزائن کے تحت لکھے گئے تھے اور خود غالب کو بھی علم تھا کہ وہ محض مکتوب نہیں لکھ رہے ایک عظیم نثری اسلوب تخلیق کر رہے تھے۔ اس اسلوب کی بنیاد غالب کی ذات ہے جسے غالب نے اپنے مکاتیب میں مختلف طریقوں سے منکشف کیا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ غالب کے یہاں برجستگی ان کے اسلوب کا حصّہ ہے۔ انھوں نے اپنی شخصیت کے خاص حصّوں کو منکشف کیا ہے اور اسی مناسبت سے اپنی زندگی کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے صرف ان واقعات کو بیان کیا ہے جو ان کی متصورہ شاعرانہ شخصیت سے مطابقت رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر انھوں نے اپنے نسب نامے اور اپنے اجداد کی امارت کو تکرار کے ساتھ مبالغہ آمیز طریقے سے بیان کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے اپنی مالی تنگ دستی کو بھی رقت آمیز طریقے سے نمایاں کیا

ہے۔ اپنی بیماری، اپنے بڑھاپے کو اور اپنے تخلیقی بنجرپن کو بڑے جذباتی اور ڈرامائی انداز سے پیش کیا ہے۔ ان تمام واقعات میں ایک طرح کا تسلسل ہے۔ غالب اپنے ماضی کے شکوہ اور حال کی زبوں حالی کا تھیسس تیار کر رہے تھے کہ ایک نابغہ روزگار کس طرح بدترین حالات میں رسوا ہو کر ایک بنجر زمین کی طرح بے حس ہو گیا تھا۔ غالب کے مکاتیب میں سوانحی مواد بھی ایک منصوبہ کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس غالب نے اپنی نجی زندگی، اپنے معاشقے اور اپنے ازدواجی حالات کو اخفا میں رکھا ہے۔ غالب دہلی میں اپنی آمد سے لے کر کلکتہ کے سفر تک اپنی مصروفیت اور اپنے تخلیقی عمل کے بارے میں اپنے قارئین کو کچھ نہیں بتاتے۔ غالب کے معاصر اہلِ علم یا انھیں درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے یا ان سے حسد کرتے تھے اسی لیے انھوں نے غالب کے احوال کو محفوظ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ چنانچہ ناگزیر طور پر ہر نقاد اور سوانح نگار کو تفہیم غالب میں ان کے مکاتیب پر بھروسہ کرنا پڑا ہے۔ ان کے مکاتیب میں تضاد بھی ہے اور تکرار بھی، اور غالب ہر معاملے میں صداقت کے اصول کو مدِنظر نہیں رکھتے۔

تمام محقق اس سے متفق ہیں کہ غالب نے اُردو میں مکتوب نویسی ۱۸۴۹/۱۸۵۰ء کے لگ بھگ شروع کی۔ غالب کے بیان کے مطابق انھوں نے اُردو میں مکتوب نویسی اس لیے شروع کی تھی کہ فارسی میں انھیں بہت کاوش سے کام لینا پڑتا تھا اور یہ محنت بڑھاپے اور بیماری میں ممکن نہیں تھی۔ غالب کا یہ بیان محض ایک بہانہ معلوم ہوتا ہے۔ غالب کو اپنی فارسی دانی پر ناز تھا۔ کئی مرتبہ انھوں نے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ ان میں فارسی نویسی کا ہنر قدرتی تھا۔ وہ جب چاہتے فارسی میں غزل یا قصیدہ لکھنے پر قدرت رکھتے تھے۔ انھوں نے فارسی میں دس ہزار کے قریب اشعار کہے۔ جس فن کار کو زبان پر اتنی قدرت ہو اس کے لیے فارسی میں مکتوب نویسی کے لیے کاوش محض ایک بہانہ معلوم ہوتا ہے۔ دراصل غالب نے اپنے اردو مکاتیب کے بارے میں یہ تاثر

دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ ان کے تساہل کی پیداوار ہیں اور وہ انھیں زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ یہ بھی غالب کا ایک پوز تھا۔ کیونکہ ان کے مکاتیب عجلت یا تساہل کی تحریر نہیں تھے ان کے لسانی اسلوب کی تشکیل پر بے حد محنت کی گئی ہے اور ابتدا میں غالب کی مقبولیت اور کامیابی کے بارے میں اتنے پُرامید نہیں تھے۔ جونہی ان کے مکاتیب کی شہرت پھیلنے لگی، ایک روایت کے مطابق وہ اپنے مکاتیب کی نقول بھی محفوظ کرنے لگے۔ وہ عودِ ہندی کی اشاعت کے بارے میں کافی متامل تھے لیکن اردو معلی کی اشاعت کے بے حد مشتاق تھے۔ غالب کہتے ہیں کہ انھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے اور ہجر کو وصال بنا دیا ہے، تو یہ رسمی مکتوب نویسی نہیں ہے اس کے پس منظر میں ایک قدآور شخصیت کی ایک نئے اسلوب کی خواہش کار فرما ہے۔ غالب کے قارئین اس امر سے آگاہ ہیں کہ غالب کی اردو شاعری کا سرچشمہ تیس سال کی عمر کے لگ بھگ خشک ہو چکا تھا اور انھوں نے اس کے بعد اُردو میں معدود چند غزلیں لکھیں۔ ایک طویل مدّت سے غالب اُردو قارئین ان کی تازہ شاعری سے محروم تھے، اگرچہ وہ اپنے اُردو کلام کی تجدید اپنے دیوان کی مکرّر اشاعت کی صُورت میں کرتے رہے۔ تاہم منطقی لحاظ سے وہ اپنی اُردو شاعری کو انجام تک پہنچا چکے تھے اور ان کی جولانیٔ طبع فارسی زبان میں اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ غالب فارسی زبان کے ذریعے اپنے شعری عمل کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔

غالب کے مکاتیب میں موضوعاتی حسنِ نہیں ہے انھوں نے فنِ شعر کے بارے میں جن افکار کا اظہار کیا ہے، وہ عمومی نوعیت کے ہیں اور فارسی شعرا کی آرا سے ماخوذ ہیں۔ شاعری کے بارے میں ان کا تنقیدی نظام فارسی تنقید کی رسمی اصطلاحات تک محدود رہتا ہے۔ وہ معاصر شعری رویّوں کے بارے میں بھی کسی رائے کا اظہار نہیں کرتے، بہت جوش میں آتے ہیں تو قاطع برہان اور برہان قاطع کی بے مغز بحث میں کھو جاتے

ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ غالب میں تنقیدی حس کی کمی تھی یا وہ شاعری کے جوہر سے آشنا نہیں تھے۔ حقیقت میں غالب کا عہد سیاسی طور پر اتنا مغلوب تھا کہ کسی بحث کی گنجائش نہیں تھی، بلکہ اتنے بڑے سیاسی آشوب کے وقت عشقیہ شاعری بھی کسی بڑی معنویت کی حامل نہیں ہے اور جس کی قدر و قیمت ذاتی آشوب سے متجاوز نہیں ہوتی۔ غالب کے مکاتیب ان کی صورتِ حال کو ان کی شاعری کی نسبت زیادہ وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ یہ ان کی امنگوں اور منصوبوں کا پتہ دیتے ہیں، ان کا اسلوب اور انداز ایک نئے معمار کے عمل کا پتہ دیتے ہیں۔ غالب کے مخاطب مہدی مجروح، حاتم، میرن صاحب عبدالغفور ایسے معمولی اور ذہنی طور پر پست لوگ تھے جن سے غالب صرف گپ ہی لگا سکتے تھے، ان سے سنجیدہ مسائل پر بات چیت ممکن نہیں تھی۔ اسی طرح غالب نے جو مکاتیب نواب رام پور یا کسی دوسرے صاحب حیثیت کو لکھے ہیں ان میں غالب کی ضرورت ان کی ذات پر حاوی رہتی ہے، ان کی سمندر کی طرح متحرک نثر رُک رُک کر چلتی ہے، سادی اور رواں نثر کی جگہ فارسی کی تراکیب لے لیتی ہیں، برجستگی کی بجائے تکلف نمایاں ہو جاتا ہے۔ غالب کے اس نوع کے مکاتیب چنداں اہمیت کے حامل نہیں ہیں بجز اس کے کہ یہ ایک نابغہ فنکار کے ذہنی زوال کی داستان بیان کرتے ہیں۔

ایک تخمینے کے مطابق غالب نے ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۶ء تک ۶۱ کے قریب اُردو میں مکاتیب لکھے، ۱۸۵۷ء میں وہ صرف ۷ مکاتیب لکھتے ہیں، ۱۸۵۸ء میں غالب ۱۲۴ مکاتیب لکھتے ہیں۔ اس کے بعد ۱۸۶۶ء تک وہ اوسطاً ۴۴ مکاتیب ہر سال تحریر کرتے۔ ۱۸۶۷ء میں غالب اپنی زندگی اور حالات سے مایوس ہو جاتے ہیں، اس سال وہ کل ۱۶ اور ۱۸۶۸ء میں ۱۷ مکاتیب لکھتے ہیں۔ اس جائزے میں غالب کے وہ مکاتیب شامل نہیں ہیں جو انھوں نے نواب رام پور کو تحریر کیے تھے۔ اس جدول سے یہ پتہ چلتا ہے کہ غالب ۱۸۵۷ء کے بعد پنشن بند ہونے کی بدولت بہت سی مشکلات کا شکار ہو گئے

تھے۔ وہ ان واقعات کا تفصیل کے ساتھ اپنے مکاتیب میں ذکر کرتے ہیں۔

غالب کا نثری اسلوب ان کے مکاتیب کے ذریعے نمایاں ہوتا ہے۔ غالب کی نثر کی یکایک روئیدگی اور بلوغت اُردو نثر کی روایت میں ایک غیر معمولی منظر ہے۔ میرامن کی نثر عمدہ تھی لیکن محدود اور درسی نوعیت کی تھی۔ غالب کو اس بارے میں اولیت بھی ہے کہ انھوں نے اُردو نثر کو تخلیقی اظہار کے لیے استعمال کیا ہے۔ جس قسم کی نثر رجب علی سرور نے لکھی یا جس قسم کی نثر غالب کے معاصرین لکھتے تھے وہ مقفیٰ اور مسجع تھی، اس میں جملے کا سٹرکچر اور الفاظ کے باہمی روابط فارسی سے ماخوذ تھے، لکھنے والے کی کوشش مافی الضمیر کی ادائیگی کی بجائے زبان کی تزئین پر تھی۔ ایسے نثری اسلوب میں نثر ایک دلہن کی طرح سج تو جاتی لیکن معانی سے تہی رہتی۔ غالب کے یہاں بھی نثر میں کہیں قافیہ کا التزام ہے لیکن غالب قافیہ کے ذریعے صوتی ہم آہنگی پیدا کرنے کی بجائے قافیہ کو جملہ کی معنوی توسیع کرتے ہیں، اس کی اثر انگیزی میں اضافہ کرتے ہیں۔ غالب جدید اردو نثر کے موجد تھے انھوں نے اردو نثر میں ایک ایسا لب و لہجہ دریافت کیا جسے مکالمہ، ڈرامہ اور قصہ گوئی کے لیے بیک وقت استعمال کیا جا سکتا ہے۔ غالب نے اُردو مکتوب نویسی میں جو اضافے یا جدتیں پیدا کیں ان کی حیثیت ثانوی ہے کیونکہ مکتوب نویسی کے اُردو میں کوئی معین ضوابط نہیں ہیں۔ غالب نے تصنع اور عبارت آرائی سے کام لینے کی بجائے مکتوب نویسی میں ایک براہِ راست اور ذاتی طریق اظہار کو اپنایا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد غالب تنہائی کا شکار تھے، کچھ بیماری اور کچھ قوتِ ارادی کے فقدان کے باعث وہ گھر سے باہر کم نکلتے تھے اس لیے وہ مکتوب نویسی کے ذریعے اپنے دوستوں اور شاگردوں سے بات چیت کرتے تھے، "یہ خط لکھنا نہیں ہے، باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب استعمال نہیں کرتا" وہ اپنے ادبی مسائل، کتابوں کی اشاعت اور دیگر چھوٹے چھوٹے امور کا اظہار بھی مکاتیب کے ذریعے کیا کرتے تھے۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے کہ غالب کے مکاتیب میں موضوعاتی حسنٰم نہیں ہے، ان میں ایک نابغہ کی شخصیت کے بعد پہلوؤں کا اظہار ملتا ہے، لیکن وہ اپنے عہد کی صورتحال کے بارے میں اکثر و بیشتر خاموش رہتے ہیں، کہیں کہیں ۱۸۵۷ء کا حال بڑے جذباتی طریقے سے بیان کرتے ہیں "پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر پہ ہوا: پہلا باغیوں کا لشکر اس میں اہلِ شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکیں و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا۔ اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی۔ مرے آدمی کم لیکن جس کو تپ آئی اس نے پھر اعضا میں طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا، مکاتیبِ غالب میں جہاں بھی ۱۸۵۷ء کی تباہ کاری کا ذکر آتا ہے، غالب کی متخیلہ حرکت میں آتی ہے، ان کی جذباتی سطح میں ترفع پیدا ہوتا ہے۔ جملوں میں آہنگ اور بہاؤ جنم لیتا ہے اور غالب عظیم الشان نثر تخلیق کرتے ہیں اور اکثر حالتوں میں ان کی تحریر نثری نظم میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں غالب چھوٹے چھوٹے جملے تعمیر کرتے ہیں، ان میں نظام اوقات کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ نثر کا یہ انداز جدید نثر کی بنیاد ہے۔

غالب نثر میں بھی بے پناہ قوتِ بیان رکھتے ہیں، وہ احساسات کو محاکات اور محاکات سے احساسات پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں:

شب و روز یا آگ برستی ہے یا خاک۔ نہ دن کو سورج نظر آتا ہے نہ رات کو تارے۔ زمین سے اٹھتے ہیں شعلے، آسمان سے گرتے ہیں شرارے۔ چاہا تھا کہ کچھ گرمی کا حال لکھوں۔ عقل نے کہا کہ دیکھ نادان! قلم انگریزی دیاسلائی کی طرح جل اٹھے گی اور کاغذ کو جلا دے گی۔ بھائی! ہوا کی گرمی تو بڑی بلا ہے۔ گاہ گاہ جو ہوا بند ہو جاتی ہے،

وہ اور بھی جاں گزا ہے ۔نثر کا یہ انداز شعریت کا حامل ہے ، غالب اکثر و بیشتر شاعرانہ وسائل کو بھی اپنی نثر میں اثر انگیزی کے لیے استعمال کرتے ہیں جس سے ان کی نثر کی خارجی سطح متغیر ہوتی رہتی ہے۔ غالب طویل اور مختصر جملہ کی تعمیر پر یکساں مہارت رکھتے ہیں بلکہ مخصوص لمحات میں مختصر جملوں سے طویل جملوں کا کام بھی لیتے ہیں۔ان کے مختصر جملے اختصار کے باوجود بوصف ایمائیت معنی کی توسیع بھی کرتے ہیں۔ جذباتی لمحات میں غالب کی نثر میں بے پناہ روانی پیدا ہوتی ہے اور وہ الفاظ تلازمات جذباتی حالت کے تحت خلق کرتے ہیں۔

غالب نے اُردو نثر کو بظاہر مکتوب نویسی کے لیے استعمال کیا ہے لیکن مکتوب نویسی کے دوران نثر کے بہت سے طن پیدا کیے ہیں، قافیہ اور سجع کا التزام بھی کیا ہے ، سہل نثر بھی لکھی ہے ، مدلل نثر بھی تحریر کی ہے ، مکالمہ ، ڈرامہ اور داستان گوئی کا رنگ بھی پیدا کیا ہے۔ ان کے مکاتیب میں موضوعاتی تکرار کے باوجود اعلیٰ نثر کی بدولت دلچسپی قائم رہتی ہے۔ غالب ہر طرح کی نثر لکھتے ہُوئے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ یہ ایک عظیم نثری اسلوب کی بدولت ہے۔ غالب کے نثری اسلوب کا مآخذ ان کی تخلیقی شخصیت ہے جو نثر نویسی کے دوران ہر وقت اور ہمیشہ اپنے جوہر کا مظاہرہ کرتی ہے۔ نئے نئے الفاظ کو نئی نئی حالتوں کے لیے استعمال کرتی ہے ، نئے نئے سیاق و سباق وضع کرتی ہے۔ شعر اور نثر کا امتزاج کرتی ہے ۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ غالب نے اردو نثر کو اپنی سوانح کے بیان اور نفسیاتی کیفیات کے اظہار کے لیے استعمال کیا ہے جس کے نتیجے کے طور پر اُردو نثر کے بہت سے معنوی امکانات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ غالب کے مکاتیب سے قبل اُردو نثر کو کبھی بھی تخلیقی اظہار کے لیے بروئے کار نہیں لایا گیا تھا۔ غالب کے مکاتیب کے ذریعے اردو نثر کی تشکیل کے عمل کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ بہت سے الفاظ اور تراکیب میں استعمال کی تازگی

کا احساس ہوتا ہے۔ غالب مروجہ الفاظ کو نئی نئی حالتوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔
کبھی کبھار انگریزی الفاظ کو بھی عبارت میں شامل کرتے ہیں۔ مجموعی اعتبار سے غالب
تن تنہا ایک ایسا ناقابلِ شکست لسانی سٹرکچر تعمیر کرتے ہیں کہ یکایک اُردو زبان ماضی
کی کسی روایت کا سہارا لیے بغیر بلوغت کو جا پہنچتی ہے۔ غالب ایک ایسا ہمہ جہتی اور
مترنم لسانی اسلوب وضع کرتے ہیں جو ابھی تک ناقابلِ تقلید رہا ہے اور اُردو کا کوئی نثر
نگار انشا پردازی اور نثری اسلوب میں غالب پر سبقت نہیں لے سکا۔

غالب اور ابہام

غالبؔ کی شاعری کے حوالے سے ابہام کا مسئلہ کافی دلچسپ ہے۔ محمد حسین آزاد کے مطابق انھوں نے مولوی فضلِ حق کے کہنے پر اپنی اُردو شاعری پر نظرِ ثانی کا فیصلہ کیا تھا، اس واقعہ کی تفصیل محمد حسین آزاد کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔ "مولوی فضل حق صاحب کہ فاضل بے عدیل تھے، ایک زمانے میں دہلی کے عدالت ضلع میں سررشتہ دار تھے اسی عہد میں مرزا خان عرف مرزا خانی صاحب کوتوال شہر تھے، غرض کہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ مضامین ان کے عام اشخاص کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا صاحب نے کہا اتنا کچھ کہہ چکا اب اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ خیر جو ہُوا سو ہُوا اب اسے انتخاب کر کے جو اشعار مشکل معلوم ہوں انھیں نکال ڈالو، مرزا صاحب نے دیوان ان کے حوالے کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے اسے دیکھ کر انتخاب کیا" آزاد کا یہ بیان بعض واقعات کے پیشِ نظر محلِ نظر ہے کیونکہ شاعری کے معاملے میں غالب کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کسی نے اسد کا تخلص لیا تو انھوں نے وہ تخلص ترک کر دیا۔ غالب اپنے معاصر شعرا کے بارے میں رائے دینے میں بھی بخل سے کام لیتے تھے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنا دیوان ایک دوست کے حوالے کر دیتے کہ وہ اس میں ترمیم و

تخفیف کرتا؟ یہ امر مُسلمہ ہے کہ کلکتہ کے سفر سے پہلے وہ کم و بیش اپنا دیوان مکمل کر چکے تھے۔ کلکتہ کے سفر کے بعد اُنھوں نے معدودے چند غزلیں لکھی تھیں۔ اور کلکتہ میں قیام کے دوران گلِ رعنا کے اُردو حصّہ کے لیے اپنی غزلوں کا انتخاب کیا تھا۔ غالب کے تخلیقی عمل کے مطالعہ سے یہ قرینہ ملتا ہے کہ ۱۸۲۸ء سے ۱۸۶۲ء تک غالب نے اُردو میں بہت کم غزلیں لکھیں اور بیشتر وقت فارسی میں شعر لکھتے یا اپنے اُردو کلام میں ترمیم کرتے رہے۔ ۱۸۶۲ء میں غالب نے اپنے کلام کا حتمی انتخاب کیا تھا وہ نسخہ نظامی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان قرائن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کلامِ غالب کا انتخاب مولوی فضل حق کی بجائے خود غالب نے کیا تھا اور وہ ایک طویل مدت تک خود اپنے شعروں کی اصلاح کرتے رہے۔ وہ اس انتخاب کے بارے میں لکھتے ہیں "جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دُور کیا، اوراق یک قلم چاک کیے، دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان حال میں رہنے دیے"۔ اپنے اسلوب شعر کی وہ ایک جگہ یُوں وضاحت کرتے ہیں "مَیں نے بھی ایک طرزِ خاص ایجاد کیا تھا جس میں ہر طرح کے مضمون کو نشو و نما ہو سکتا تھا مگر یاروں نے چلنے نہ دیا اور سچ پوچھو تو وہ ایجاد ناسخ کا ہے۔"

غالب کے اس بیان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ ناسخ کی پیروی میں ایسی زبان مخترع کرنا چاہتے تھے جس میں ہر طرح کے مضامین کا اظہار ممکن ہو۔ لیکن غزل میں نئی شعری زبان کی تشکیل کی بدولت غالب کے معاصرین نے انھیں لا یعنی شاعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ غالب نے اس معاصر تنقید سے گھبرا کر اپنے کلام کو سہل بنانے کے عمل کا آغاز کیا تھا۔ شاعری میں غالب کی مشکل پسندی اور ابہام کے بارے میں اُردو کے نقادوں نے بھانت بھانت کی باتیں کی ہیں۔ لیکن سب نے ایک ہی طرح کا نتیجہ نکالا ہے اور سب نے کم و بیش وہی کچھ کہا ہے جو حالی نے کہا ہے۔ غالب کی مشکل پسندی

پر اعتراضات کا لبِ لباب یہ ہے کہ ان کے اشعار سمجھ میں نہیں آتے، وہ اُردو شاعری میں فارسی تراکیب اور الفاظ اس حد تک استعمال کرتے تھے کہ سوائے فعل کے تمام شعر فارسی میں ہوتا۔ غالب تشبیہہ میں بعید القیاس مشابہتوں کو استعمال میں لاتے تھے جس کے نتیجہ کے طور پر ان کے اشعار مبہم یا لایعنی ہو جاتے۔ قاری شعر کے مافیہ تک رسائی حاصل کرنے کی بجائے اس کے لسانی پیرائے میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

کلامِ غالب میں ابہام کے مسئلہ کا از سرِ نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے کیونکہ اُردو غزل کی روایت میں غالب پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے قارئین کے لیے ابہام کا کرائسس پیدا کیا تھا۔ انھیں اپنی زندگی ہی میں احساس ہو گیا تھا کہ ان کے زبان سازی کے عمل نے قارئین میں ایک ردِ عمل پیدا کیا تھا۔ چنانچہ اپنے کلام کے بیشتر حصہ کو مسترد کر کے منتخب کلام کو پیش کرنے کا منصوبہ غالب کی ذہنی پسپائی تھی۔ ایک شاعر کا اپنے نصف کلام کو مسترد کر دینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ دیوانِ غالب نسخہ نظامی ۱۸۶۲ غالب نے خود مرتب کیا تھا۔ اسے اگر نسخہ عرشی کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ کلامِ غالب کا بہترین انتخاب نہیں ہے کیونکہ غالب نے بعض بہت خوبصورت غزلوں کو رد کر کے اپنے دیوان میں بھرتی کی غزلیں بھی شامل کی ہیں جو ان کے ہنر کا ثبوت نہیں ہیں:

ع دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں

ع جب بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا

اس طرح کی دیگر غزلیات کو دیوان سے خارج کر کے ان کی جگہ مسترد شدہ کلام سے نئی غزلیات شامل کی جا سکتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے جملہ کلام سے ان کی شاعری کا ایسا انتخاب تیار کیا جائے جو ان کے جملہ شعری لہجوں اور تدریجی تغیرات کے عمل کی نمائندگی کر سکے۔ عموماً کسی شاعر یا مصنف کا انتخاب معتبر نہیں ہوتا کہ وہ خود اپنی تحریروں کے بارے میں شخصی تعصبات کا شکار ہوتا ہے۔ غالب کی مثال بھی

لیجیے، وہ اپنی فارسی شاعری کے بارے میں بے پایاں احساسِ تفخر میں مبتلا تھے اور اپنی اُردو شاعری کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے لیکن سب نے دیکھا کہ ان کی فارسی شاعری ان کی زندگی ہی میں نظرانداز ہوگئی تھی۔ دیوانِ غالب کا انتخاب ایک طرح کے ردِ عمل کا نتیجہ ہے یا اس احساس کی پیداوار ہے کہ انھوں نے رنگِ بیدل میں طبع آزمائی کر کے اپنے ہنر کا ضیاع کیا ہے۔ تخلیقی سطح پر غالب ایک طرح کے تضاد کا شکار تھے، ایک طرف وہ ناسخ کے مداح تھے، دوسری طرف وہ رنگِ میر کے ثناخواں تھے۔ یہی دو رنگ ان کی شاعری میں دستیاب ہیں۔ تاہم یہاں ایک مغالطے کا ازالہ ضروری ہے کہ جو شعر سہل ہو رنگِ میر میں نہیں ہوتا اصل حقیقت یہ ہے کہ غالب ناسخ کے دوست تھے اور ان کا مذکورہ بیان اپنے عہد کی شاعری کا تجزیہ کرنے کی بجائے حقِ دوستی زیادہ ادا کرتا ہے۔ دوسری طرف غالب کلکتہ کے سفر سے قبل اپنے اُردو کلام کا بیشتر حصہ لکھ چکے تھے۔ معاصر ادبی آراء اور ادبی تذکرے غالب کے اس بیان کی تصدیق نہیں کرتے کہ ۱۸۲۵ء تک دہلی کی شاعری ناسخ کے کلام سے متاثر تھی۔ ناسخ ایک تک بند شاعر تھا جس کی شاعری میں الفاظ کی اچھی بندش کے سوا اور کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے۔ غالب کا کلام ناسخ سے متاثر ہونا قرینِ قیاس نہیں ہے۔ یُوں لگتا ہے کہ غالب شاعری میں ایک نئی زبان مخترع کرنا چاہتے تھے جو ہر طرح کے مطالب کے اظہار کی سکت رکھتی ہو، چنانچہ اس عمل میں اُنھوں نے بیدل کو نمونہ بنایا کہ زبان سازی کے ذریعے تشکیلِ معانی کی جائے۔ چنانچہ غالب کی شاعری میں ابہام کی ایک وجہ ان کا زبان سازی کا عمل ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات مسلمہ ہے کہ میر کی وفات کے بعد اُردو غزل کے مزاج اور لب و لہجہ میں ٹھہراؤ پیدا ہو چکا تھا وہ اوپرا پن جو حاتم اور دوسرے متقدمین کی شاعری میں محسوس ہوتا ہے وہ میر کی غزل کے بعد ختم ہو چکا تھا، فارسی غزل کے مضامین اور تراکیب کے براہِ راست ترجمہ کی بجائے غزل کو جذبات کے اظہار کے لیے استعمال کیا جانے لگا

تھا۔ اردو غزل فارسی غزل کا تتبع کرنے کی بجائے اپنا منفرد وجود قائم کر رہی تھی۔ غالب نے زبان سازی میں اس عمل کو روک کر اُردو غزل کو ایک بار پھر فارسی غزل کے ماڈل پر پڑھانے کی کوشش کی، اور اپنے ادبی مرشد بیدل کی فکری پیچیدگی کو مشعل راہ بنایا۔ غالب کی اس ادبی مشق کا اس قسم کا نتیجہ برآمد ہوا:۔

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازار دوست
دود شمع کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہری قاتل
کہ اندازِ بہ خوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

اس قسم کی غزلوں میں ضرورت سے زیادہ اضافتوں کا استعمال، فارسی اور اُردو الفاظ سے نئے لسانی مرکبات کی تعمیر اور لہجے میں شکوہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ غالب کے مسترد کلام اور متداول دیوان میں شامل ابتدائی چند غزلوں کا یہی انداز ہے۔ ان کی معنوی حیثیت پر غور کیا جائے تو کوئی قابلِ قدر تجربہ یا کوئی انسانی بصیرت یا فلسفیانہ رمز منظرِ عام پر نہیں آتی۔ چنانچہ ایسی غزلیں ایک ماہر شاعر کی لسانی مشقیں ہیں جن میں شاعری کا عنصر بہت کم ہے، ان کا لسانی اسلوب جس معنی کا وعدہ کرتا ہے وہ دستیاب نہ ہونے پر قاری کو دھچکا لگتا ہے۔ شاید اسی باعث غالب کے معاصر قاری ان کے اشعار کو بے معنی کہتے تھے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ میر اپنے عہد میں اور بعد میں بھی اُردو غزل پر چھائے ہوئے تھے ان کی شاعری میں سہلِ ممتنع کے عنصر نے شاعری کے برجستہ افہام کا جو تصور قائم کیا غالب کے زمانے کا قاری اس فریم ورک سے باہر نکلنے کو تیار نہیں تھا۔ ادھر مشاعرے بھی آہ واہ کے ادبی معیار کا تقاضا کرتے تھے ان کے لیے غالب کی شاعری ناقابلِ فہم تھی، کیونکہ وہ شاعری میں فوری افہام کے قائل نہیں تھے۔ اگر وہ اس کے قائل ہوتے تو ان کی شاعری

کی بنت اُردو کے مروجہ غزل گو شعرا جیسی ہوتی۔ وہ اپنی غزل میں چاہے وہ مشکل ہو یا آسان معنی آفرینی کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔ بے معنی اور بامعنی شاعری کی بحث بے حد ادق ہے، یہ شاعری کی بنیادی توصیف سے لے کر شاعری کے معیاروں پر محیط ہے۔ معنی کی کئی ایک تعریفیں ہیں۔ فلسفہ اور علم المعانی کی کتابوں میں معنی کے معنی کی مختلف اشکال ملتی ہیں۔ معنی کسی وقوعہ کی علامت ہوتا ہے۔ معنی کسی شعوری عمل کا ارادہ یا مقصد ہے۔ جو کچھ الفاظ یا علامتوں کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے یا جس کا تضمن کیا جاتا ہے اسے معنی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شاعری اور نثر میں معنی کی صورت بدلتی رہتی ہے، اس کا انحصار جملے یا مصرعے کی غایت پر ہوتا ہے۔ شاعری میں معنی اظہاریاتی ہوتا ہے کہ معنی کی تشکیل میں شاعر کی جذباتی اور نفسیاتی حالت معنی کا رُخ معین کرتی ہے اور اس کے ساتھ اس کے تجربے کی لسانی تشکیل اس کے سیاق و سباق کا تعین کرتی ہے۔ اس لیے شاعری میں ہو بہو معنی یا براہِ راست معنی کے افہام کا مطالبہ شاعری کو نثر بنانے کا عمل ہے۔

غالب جب جھنجھلا کر کہتے ہیں :۔

نہ ستائش کی تمنا نے صلے کی پرواہ
گر نہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ غالب شاعری میں معنی کے وجود سے منکر ہیں، یہ شعر معاصر تنقید کے خلاف ردِ عمل ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب اور ان کے قارئین کے درمیان ایک بعد تھا ان کا شاعری کا تصور اپنے قارئین کی نسبت مختلف تھا۔ ان کے عہد کا شعری مذاق شاعری کے فوری افہام کا تقاضا کرتا تھا جب کہ غالب ایک نیا جذباتی سیاق و سباق ایک ایسی زبان کے حوالے سے مرتب کر رہے تھے جو ایک حد تک متروک ہو چکی تھی۔

غالب کی شاعری میں ابہام کی ایک وجہ ان کی متخیلہ کا غیر معمولی عمل ہے۔ غالب

کے یہاں متخیلہ نئی نئی حالتوں کی دریافت، اشیا میں توافق، تضاد اور انتصال کا کام کرتی ہے۔ غالب غیر مانوس نفسیاتی حالتوں کو قابلِ محسوس طریقے سے بیان کرتے ہیں، اس کے لیے وہ نئے لسانی لاحقے تعمیر کرتے ہیں جو غزل کے عام قاری کے توقعاتی معنی کی پیروی نہیں کرتے جس کے نتیجہ کے طور پر افہام کا عمل براہِ راست نہیں ہوتا۔ وہ براہِ راست تجربے کو بیان کرنے کی بجائے، تجربے کی نشاندہی کرتے ہیں اور قاری اپنی ذہنی استعداد کے مطابق اس سے معنی اخذ کرتا ہے، یعنی معانی پہلے سے شعر میں معین صورت میں نہیں ہوتے، ان کی تعمیر کی جانی ضروری ہے۔ جو شاعر شاعری میں ترسیل معنی کی بجائے تشکیل معنی کرتا ہے اس کی شاعری کی معنوی پرتیں ناگزیر طور پر ایک سے زیادہ ہوتی ہیں جس کے نتیجے کے طور پر معنوی سطح پر اس کی شاعری میں ابہام پیدا ہونا لازمی ہے۔

- غالب کی شاعری میں ابہام کی ایک وجہ وہ جذباتی اور نفسیاتی حالتیں ہیں جنھیں وہ اپنا موضوع بناتے ہیں اور جو ان کے عہد کی غزل کے لیے ایک اعتبار سے غیر مانوس تھیں۔ اس لیے ان کا فوری افہام ممکن نہیں تھا، اسی باعث غالب کے معاصر قارئین نے ان سے آسان گوئی کا مطالبہ کیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ غالب کی آسان گوئی یا جسے سہلِ ممتنع کہا جاتا ہے۔ اس کا لسانی پیرایہ ضرور آسان ہے، اس میں برجستگی بھی محسوس ہوتی ہے مگر معنوی سطح پر پیچیدگی قائم رہتی ہے۔

غالب کی شاعری میں ابہام کی سب سے بڑی وجہ ان کی تمثال سازی ہے، ان کی تشبیہوں میں مشبہ اور مشبہ بہ میں وجہ اشتراک قریب کی بجائے بعید کی ہوتی ہے، بلکہ بعض شعروں میں وہ اس مماثلت کو فرض کر لیتے ہیں۔ جب وہ تشبیہہ سے ہٹ کر تمثال سازی کرتے ہیں تو یہ عمل زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے، وہ مصرع اول میں کسی تصور یا حالت کو تجرید کے طور پر پیش کرتے ہیں اور مصرع ثانی میں اس کی تمثال تیار کرتے ہیں یعنی وہ

ایک ہی بات کو بیک وقت تجرید اور تجسیم کے طور پر پیش کرتے ہیں، بعض دفعہ یوں ہوتا ہے کہ علت یا تقابل پیدا کرنے کے عمل میں ہر دو میں تفاوت رہ جاتا ہے جس کے نتیجے کے طور پر کھینچا تانی کر کے مطلب اخذ کرنا پڑتا ہے۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ابہام شعر کا نقص ہونے کی بجائے اس کا حسن ہوتا ہے بشرطیکہ اس کا تعلق معنی سے ہو۔ اگر ابہام تجربہ کی ناپختگی یا کسی لسانی سقم کا نتیجہ ہو تو وہ یقیناً نقص ہے۔ جہاں تک کلام غالب میں ابہام کا تعلق ہے ان کے دیوانِ غالب کے انتخاب کی اہم وجہ شاعری میں لسانی گورکھ دھندے سے نجات حاصل کرنا تھا جس کی تعمیر پر غالب نے کافی محنت صرف کی تھی لیکن جس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ ابہام ایک اضافی اصطلاح ہے کیونکہ شاعری میں ابہام سدا قائم نہیں رہتا۔ ایک عہد کی شاعری کا ابہام دوسرے عہد کے قارئین کے لیے ابہام نہیں ہوتا، کیونکہ شاعری کی تشریح کا عمل جاری رہتا ہے اور قارئین بتدریج اپنی تربیت کرتے رہتے ہیں۔ آج کے حوالے سے کلامِ غالب مبہم نہیں ہے البتہ اس کا کچھ حصہ جذباتی تجربہ کے اعتبار سے مصنوعی ہے۔ غالب نے اپنی فنی مہارت کا ثبوت دینے کے لیے غزل کی لغت کو ازسرِنو مرتب کرنے کی کوشش کی تھی، اس کی غایت تنگ نائے غزل میں وسعت پیدا کرنا تھی اور ناقابلِ بیان کو بیان کرنا تھا۔ غالب اُردو غزل کے لسانی اسلوب کو جس نہج پر مرتب کرنا چاہتے تھے وہ متروک ہو چکا تھا، حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ شاعری کا مزاج بھی بدلنے لگا تھا، غالب کی زندگی ہی میں فارسی شاعری کم و بیش متروک ہو چکی تھی، اس لیے اُردو غزل میں فارسیت کے حوالے سے زبان سازی کا عمل بے وقت کی راگنی تھی۔ غالب کو اس تغیر کا بروقت احساس نہیں ہوا اس لیے ان کی شاعری کا ایک معقول حصہ لسانی گورکھ دھندے میں اُلجھ گیا اور غالب اپنے کلام کی اصلاح اور کانٹ چھانٹ کے ذریعے اس کی تلافی کرتے رہے۔

غالب اور پنجاب آرکائیوز[1]

حکومت پنجاب کے محافظ خانے واقعہ مقبرہ انارکلی میں انگریزوں کے عہد کی بہت سی نادر دستاویزات، تصاویر اور مسودات موجود ہیں جو ۱۸۵۷ء کے بعد صوبہ پنجاب کے انتظامی، تعلیمی اور معاشرتی حالات کے بارے میں مفید معلومات فراہم کرتے ہیں۔ بہت سی دستاویزات ایسی بھی ہیں جو پنجاب کی نئی حد بندی کے بعد دہلی سے لاہور منتقل ہوگئی تھیں۔ سوئے اتفاق محافظ خانے میں غالب سے متعلقہ تین دستاویزات بھی موجود ہیں جو اتنی نادر تو نہیں ہیں کہ ان کے منظرِ عام پر آنے سے حیاتِ غالب کے کسی نئے پہلو کے سامنے آنے کا امکان ہو، تاہم ان دستاویزات سے ان کی زندگی کی تفصیلات میں اضافہ ہوتا ہے۔

پنجاب آرکائیوز میں غالب سے متعلقہ صرف تین دستاویزات ہیں، دو کا تعلق براہِ راست غالب سے ہے جب کہ تیسری امراؤ بیگم کی پنشن کے لیے درخواست ہے۔ اس کا متن وہی ہے جو امراؤ بیگم کی دوسری درخواستوں کا ہے۔ امراؤ بیگم غالب کی وفات کے بعد ایک سال زندہ رہیں، انھوں نے ستر سال کی عمر پائی۔ مذکورہ درخواست میں بھی پنشن مقرر کرنے کی فریاد ہے، اپنے بڑھاپے، بے سروسامانی، اور اپنے متبنیٰ حسین علی خان کی تنخواہ کی بے بسی کا شکوہ کیا ہے کہ کسی طرح انگریز حکمرانوں کا دل

---

[1] محافظ خانہ

پلیسیج جائے۔ دہلی کی کمشنری نے امراؤ بیگم کی دس روپے ماہوار مقرر کی تھی لیکن شرط یہ لگائی تھی کہ وہ عدالت میں اپنا حُلیہ درج کرائیں اور خود یہ پنشن وصول کیا کریں۔ امراؤ بیگم کو یہ شرط منظور نہیں تھی، انھوں نے بھی اس کو خاندانی روایت کے خلاف تصوّر کیا تھا۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ غالب بوقتِ مرگ ۸۰۰ روپے کے مقروض تھے اور یہ قرض ان کی وفات کے بعد امراؤ بیگم کی منت سماجت کے بعد بڑی مشکل سے ریاست رام پور نے ادا کیا تھا۔ غالب کا ذاتی اثاثہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ موت کے فوراً بعد ہی غالباً مالی دقت کے پیشِ نظر غالب کے اعلیٰ کپڑے، برتن، خلعتیں وغیرہ فروخت کر دی ہوں گی۔ ان کی ذاتی اشیاء میں سے شاید کوئی چیز بھی یادگار کے طور پر کہیں محفوظ نہیں ہے۔ یہ ایک بے حد افسوسناک امر ہے۔ امراؤ بیگم کی زیرِ نظر اور دوسری درخواستوں سے اس مفروضے کو تقویت ملتی ہے کہ لوہارو خاندان امراؤ بیگم اور غالب دونوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ امراؤ بیگم کی اس درخواست میں سب سے اہم بات حسین علی کا تذکرہ ہے، باقر علی اور حسین علی غالب کے متبنیٰ عارف کے بیٹے تھے اور عارف غالب کی سالی کا بیٹا تھا۔ ایک اعتبار سے وہ غالب کے خاندان سے نہیں تھے، اس کے باوجود انھیں عارف سے بے حد لگاؤ تھا اور اس کا مرثیہ اس محبت کا ثبوت تھا۔ یہ غالب کی اپنی تنہائی اور اولاد کی کمی تھی کہ انھوں نے عارف کی وفات کے بعد اس کے دونوں بیٹوں کو اپنا لیا تھا، اور ہر طرح کی تنگی ترشی کے باوجود ان کے مصارف برداشت کرتے رہے۔ غالب کے یہ دو منہ بولے جسمانی اور ذہنی اعتبار سے بیمار تھے —— باقر علی کے پاس کوئی معقول ملازمت نہیں تھی اس کے باوجود اہلِ خانہ کے اصرار پر اس کی کم سنی میں شادی کی گئی اور وہ غالب کو چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت میں لگ گیا، اسے غالباً ٹی بی کا مرض تھا اور اس کی ذہنی صحت بھی کچھ مشکوک تھی۔ امراؤ بیگم کی زیرِ نظر درخواست سے یہ امر پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آتا ہے کہ حسین علی خان فاترالعقل

تھا اور اس امر کے باوجود لوہارو خاندان کی طرف سے غالب پر یہ دباؤ تھا کہ وہ اس کے لیے جلد از جلد ملازمت تلاش کر کے اس کی شادی کا اہتمام کریں۔ دیوانگی اور عسرت میں شادی پر اصرار ایک ناقابلِ بلکہ احمقانہ مطالبہ تھا۔ غالب کے مکاتیب سے کہیں کہیں یہ مترشح ہوتا کہ بڑھاپے میں ان دو بیوقوفوں نے غالب کا ناطقہ بند کیا ہُوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ امراؤ بیگم غالب کی طرف دار نہیں تھیں اور غالبًا غیر شعوری سطح پر وہ غالب کو شاید ایذا میں رکھنا چاہتی تھیں، یہ ان کا غالب کے خلاف ایک ردِ عمل تھا کہ وہ نکھٹو تھے، شرابی تھے اور شاید تماش بین بھی تھے۔

غالب سے متعلق اس محافظ خانے میں دوسری دستاویز برہانِ قاطع سے متعلقہ ایک مسل ہے جس میں دفتری نوٹنگ کا انداز ہُو بہُو وہی ہے جو آج کل مروج ہے۔ یہ ۲۵ ستمبر ۱۸۶۶ء کی بات ہے کہ غالب نے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کو ایک درخواست دی کہ ان کی کتاب قاطع برہان کو سینئر سکولوں کے لیے منظور کیا جائے، اس درخواست کے جواب میں محکمہ تعلیم نے اس کتاب کے بارہ نسخے خریدے۔ یہ درخواست ایک پیش خیمہ تھی، غالب کا ہدف یہ تھا کہ اگر محکمہ تعلیم اس کتاب کو منظور کرے تو ان کی کتاب قاطع برہان کی خرید سے اُنھیں مالی فائدہ ہو سکتا ہے۔ لاہور کے محافظ خانے میں اس موضوع پر ایک مسل موجود ہے۔ ۱۵ ردسمبر ۱۸۶۶ء کو غالب نے پھر محکمہ تعلیم کو درخواست دی کہ برھان قاطع کو نصاب میں شامل کیا جائے۔ اس وقت کے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن نے برہانِ قاطع کو گورنمنٹ کالج لاہور کے عربی اور فارسی کے پروفیسر علمدار حسین کے پاس رائے کے لیے بھیجی۔ پروفیسر موصوف نے دو صفحات میں اس کتاب پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اسے ناقص کتاب قرار دیا۔ چنانچہ اس طرح پروفیسر علمدار حسین نے غالب پر مالی سہولت کا آخری دروازہ بھی بند کر دیا۔

لاہور کے محافظ خانے میں غالب سے متعلقہ چوتھی دستاویز غالب کی گورنر جنرل ہند

کے نام درخواست ہے، یہ ۸ رجون ۱۸۴۸ء میں تحریر کی گئی تھی۔ یہ تین صفحات پر مشتمل ۱۰۰۱ گرام کے براق کاغذوں پر سیاہ روشنائی سے شکستہ خط میں تحریر ہے، جو غالباً دہلی کے کسی وثیقہ نویس نے انگریزی زبان میں لکھی ہے، انگریزی کا اسلوب بچگانہ سا ہے۔ درخواست کے نیچے انگریزی زبان میں اختتامی کلمات درج ہیں اور جن کے نیچے اُردو میں رقم ہے: عرضداشت اسداللہ خان برادرزادہ نصراللہ خان جاگیردار سونک سونسہ معروضہ ۲ رجون ۱۸۴۸ء یہ وہ زمانہ ہے جب غالب پنشن کا مقدمہ ہار چکے تھے اور اب اسی آس پر جیتے تھے کہ حکمران کسی طرح ان کا مؤقف تسلیم کریں۔ غالب کی اس درخواست سے مترشح ہوتا ہے کہ نواب شمس الدین دیوالیہ ہوگیا تھا اور اس کے قرض خواہ اس کی آمدنی میں ایک روپیہ میں سے ۸ آنے اور چھ پیسے کے حقدار ٹھہرائے گئے تھے۔ اس پر غالب ایک دم چونکے ہوگئے کہ کہیں ان کی پنشن میں کسی قسم کی تخفیف نہ ہوجائے کیونکہ ان کی پنشن کی رقم نواب شمس الدین کی جاگیر سے وصول ہوتی تھی۔ یہ استمرار کی رقم کا وہ حصہ تھا جو انگریز حکام نے مقرر کیا ہوا تھا۔ غالب کا پنشن میں تخفیف کا خدشہ ان کا عدم تحفظ کا خوف تھا، اور شاید اسی باعث جب تک نواب احمد بخش زندہ رہا غالب کو اس سے رو برو ہونے کا حوصلہ نہیں تھا، تاہم اس درخواست میں غالب کا لہجہ درشت ہے اور انھوں نے اپنی پنشن میں کمی کی وجہ نواب احمد بخش کی عیاری بتائی ہے۔

غالب سے متعلقہ ان دستاویزات کو پنجاب آرکائیوز نے اچھے طریقے سے محفوظ کیا ہے، اور ان سے متعلقہ مختصر سی سرکاری مسلیں بھی موجود ہیں جن کی تاریخی اہمیت صرف اتنی ہے کہ یہ غالب کی ذات سے متعلق ہیں لیکن ان کی سوانح کے کسی پہلو پر کسی نئے واقعہ کی نشاندہی نہیں کرتیں۔